دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۰۸ | ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ مطابق اکتوبر ۲۰۲۴ء | شمارہ: ۱۰

نگراں

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 108, Issue No. 10, Oct. 2024 अक्तूबर **2024**
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 30/= | Annual Subscription Rs. 300/=

Annual by Regd Post. Rs. 550/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۵۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز	لاریب فیہ	محمد سلمان بجنوری	۳
فکر ونظر	اِلحادِ جدید-تعارف، محرکات اور تدارک	مولانا انعام الحق قاسمی	۵
//	علامہ شبلیؒ کی کتاب: ''الکلام'' کا مطالعہ	ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۱۵
اصلاح ورہنمائی	خوش نما لباس میں عبادت اور ننگے سر....	مولانا عبداللطیف قاسمی	۲۲
//	رسم ورواج کا شرعی حکم	مفتی عبیدالرحمٰن مردان	۳۲
ذکر رفتگاں	حضرت مولانا محمد فاروق شہیدؒ	مولانا محمد صغیر قاسمی	۴۰
مسائل وفتاویٰ		مفتیانِ دارالعلوم دیوبند	۵۳
تبصرہ	نئی کتاب	ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/550 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

لاریب فیہ

محمد سلمان بجنوری

قرآن کریم، بلاشبہ خالق کائنات کا کلام ہے، جس کی مکمل تصدیق مدارِ ایمان ہے، قرآن کریم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے اور اسی بات پر تمام مسلمان ایمان رکھتے ہیں اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں سمجھتے؛ لیکن کبھی کچھ باتیں ایسی ہوجاتی ہیں جو اس معاملے میں غیرضروری بحث چھڑنے کا سبب بن جاتی ہیں، جیسا کہ حال ہی میں، پڑوس کے ایک عالم دین کی غلطی سے ایسا ہوگیا کہ جو طبقہ اسلام دشمن ہے یا جو لوگ تشکیک پسند ہیں ان کو موقع مل گیا اور انھوں نے اس موقع کا استعمال شروع کردیا۔

ہمیں اس بات پر پورا اعتماد ہے کہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان قرآن کریم کے بارے میں کسی ادنیٰ شک کو اپنے ذہن ودماغ میں راہ نہیں دے سکتا، یہاں تک کہ جن صاحب سے یہ چوک ہوئی، ان کے ایمان وعقیدہ؛ بلکہ نیت کے بارے میں بھی کسی شک کا موقع نہیں ہے؛ لیکن اس مناسبت سے ضروری ہوگیا ہے کہ ہم ایک ضروری بات پر اپنی توجہ پہلے سے زیادہ مبذول کریں اور اس بارے میں ضروری کام شروع کریں۔

وہ بات درحقیقت کوئی نئی چیز نہیں ہے؛ بلکہ اسلام دشمن عناصر کا پرانا طریقۂ کار ہے کہ وہ ہر دور میں حاصل شدہ وسائل کو استعمال کرکے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی عقائد ونظریات اور احکام ومسائل کو باطل ثابت کریں اور لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کریں، یہ کام صدیوں تک مستشرقین کے ایک طبقہ کے ذریعہ ہوا ہے اور اس کے برگ وبار اب تک ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اب اس میدان میں ہمارے وطن عزیز کا وہ ذہن بھی سرگرم ہوگیا ہے جو آرایس ایس کی محنت سے وجود میں آیا ہے، اس طبقہ کے مفکرین نے شاید اس بارے میں کوئی تفصیلی پلان تیار کرلیا ہے، جس کے تحت مختلف مورچوں پر اُن کے نمائندے کام کررہے ہیں۔

اس طبقہ کے بارے میں ہماری معلومات عام طور سے بہت ناقص اور مجمل ہیں، بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ فرقہ پرست ذہن ہے جو مسلم مخالف ہے اور ہندوستان میں سیاسی غلبہ کے لیے کام کررہا ہے؛ لیکن اگر آج کل کے ذرائع ابلاغ خاص طور سے سوشل میڈیا پر آپ کی کچھ نظر ہو تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ بات بہت آگے جاچکی ہے۔ اب ان کے ترجمان مقررین اور اہل قلم اسلام اور تاریخ اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں، اس مقصد کے لیے وہ اسلامی علوم کا تفصیلی مطالعہ کررہے ہیں یا ایسے لوگوں کو اجرت پر استعمال کررہے ہیں اور ان کی مدد سے اپنے منفی پروگرام پر عمل کررہے ہیں؛ چنانچہ قرآن کریم کے بارے میں حال میں ہونے والی چوک بھی اُن کے لیے ایک اچھا موقع ثابت ہوئی ہے اور انھوں نے اس کو بھی استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔

ہمیں اس بات پر کامل اعتماد ہے کہ ساری دنیا کی طاقتیں مل کر بھی قرآن یا اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں؛ لیکن اگر خدانخواستہ اُن کی کوششوں سے کچھ لوگوں کا یقین کمزوری کا شکار ہوجائے، شکوک وشبہات ذہنوں میں آجائیں یا کچھ دوسرے لوگ اسلام سے مزید دور ہوجائیں تو یہ بھی کوئی چھوٹا نقصان نہیں ہے، ہماری ذمہ داری تو یہ ہے کہ دوسروں تک قرآن اور اسلام کا پیغام، ایمان کی طاقت اور دلیل کی قوت کے ساتھ پہنچائیں، اسی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں ہونے والی منفی کوششوں پر نظر رکھیں اور اُن کا مضبوط جواب دیں، نیز اپنی کسی علمی یا غیر علمی بحث اور گفتگو سے اُن کو فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب حالات ایسے موڑ پر آگئے ہیں کہ ہمیں قرآن، اسلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہونے والے منفی پروپیگنڈوں پر مسلسل نظر رکھنی ہوگی اور اُن کا بروقت اور مدلل جواب دینا ہوگا، اتنا کافی نہیں ہوگا کہ کوئی بات سامنے آجائے تو اس کا جواب دے دیا جائے ورنہ خاموش بیٹھ جائیں۔ ایسا کرنا اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرادف ہوگا، اللہ رب العزت ہمیں اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

* * *

اِلحادِ جدید- تعارف، محرکات اور تدارک

از: مولانا انعام الحق قاسمی
ریسرچ اسکالر: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

خدا کا انکار کوئی نئی بات نہیں، ماضی میں بھی اس خیال ورجحان کے حاملین موجود رہے ہیں، اگر چہ ان کی تعداد تھوڑی ہی رہی ہو۔ قدیم منکرین وملحدین محض ذاتی شبہات وخیالات یا فلسفہ کی بنیاد پر خدا کا انکار کرتے تھے؛ جب کہ جدید ملحدین فلسفہ کے ساتھ جدید سائنس کو بھی اپنے لیے سند بناتے ہیں اور اُلوہیت کے تصور کو رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب ان کی یہ کوششیں ایک تحریکی صورت اختیار کر چکی ہیں، بالخصوص ''نائن الیون'' کے بعد بڑے زور وشور سے اپنے افکار کی اشاعت کر رہے ہیں اور اس کے غالب کرنے پر مصر ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ مذہب نے دنیا کو ہمیشہ جنگ وجدال، قید وبند، ظلم وجبر اور تباہی وبربادی دی ہے اور اس طرح دنیا کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے، لہٰذا اب ہمیں نظامِ دنیا سنبھالنے دو، ہم امن، سلامتی، آزادی، مساوات اور انصاف قائم کریں گے۔

جدید تحریکِ الحاد کا آغاز سولہویں صدی کے آخر سے مانا جاتا ہے۔ سترہویں صدی میں جب اہل سائنس نے عیسائیت کو عقلی ومنطقی میزان پر جانچنا چاہا، اس کے نتیجے میں چرچ اور ریاست کے مابین عظیم کشمکش برپا ہوئی، فلسفیوں نے مذہب پر بے لاگ تنقیدیں کیں۔ مذہب بیزاری کا رجحان عام ہوگیا۔ جدید فلسفہ کا بانی Rene Descartes (۱۵۹۶-۱۶۵۰ء) باوجود یہ کہ خدا کا قائل تھا، اس نے فلسفہ اور مذہب میں تقسیم وتفریق پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کی اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس کے نظریے کو Immanuel Kant (۱۷۲۴-۱۸۰۴ء) نے اپنے پُرزور دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے بعد مشہور امریکی فلسفی Thomas Paine (۱۷۳۷-۱۸۰۹ء) نے اپنی کتاب ''The age of reason'' میں عیسائیت اور موجودہ بائبل کی غیر منطقی باتوں کو شدید تنقیدوں کا

نشانہ بنایا، اس کے بعد ملحد فلسفیوں کی جانب سے مستقل تنقیدوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ تنقیدیں مرحلہ وار انکارِ خدا تک پہنچیں اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی لہر بامِ عروج پر پہنچ گئی۔

اس کے بعد اب ایک طبقہ ڈیزم (Deism)[1] کی جانب اپنا رخ کر رہا ہے؛ کیوں کہ سائنس نے جن بنیادوں پر خدا کا انکار کیا تھا، انھیں خود سائنس نے باطل ثابت کر دیا ہے؛ جب کہ دوسرا طبقہ اپنے موقف پر مصر؛ بلکہ پوری شدومد کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس دوسرے طبقے میں چار نام ایسے ہیں، جو اِلحادِ جدید کا حقیقی سرغنہ تسلیم کیے جاتے ہیں، انھیں اصطلاحی طور پر ''Four Horsemen'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱- رچرڈ ڈاکنز (پ:۱۹۴۱ء)
۲- ڈینیئل ڈینیٹ (۱۹۴۲-۲۰۲۴ء)
۳- کرسٹوفر ہچنس (۱۹۴۹-۲۰۱۱ء)
۴- سیم ہیرس (پ:۱۹۶۷ء)

عبداللہ بن صالح العجیری نے اپنی کتاب 'ملیشیا الالحاد' کے مقدمہ میں یہ صراحت کی ہے کہ الحاد کے تعلق سے مذہبی طبقے میں عام طور پر دو تصورات پائے جاتے ہیں:

۱- الحاد مذہبی منظر نامہ میں استثنائی حیثیت رکھتا ہے اور مجموعی طور پر ملحدین کی بہت کم تعداد ہے؛ لیکن اب یہ خیال صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ آج ملحدین کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ Central Intelligence Agency سے نکلنے والی کتاب 'The World Fact Book' سے پتہ چلتا ہے کہ 2010ء میں ہونے والے سروے کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں ملحدین کی تعداد 2.01% ہے۔

۲- الحاد کمیونزم (Communism) سے مربوط ہے، جب کمیونزم کا رجحان بڑھا تو الحاد کا رجحان بھی بڑھ گیا اور جب اس کا زور کم ہوا تو الحاد بھی کمزور پڑ گیا۔ یہ بات تو درست ہے کہ جن ملکوں سے کمیونزم کا غلبہ ختم ہوا، وہاں مذہب نے واپسی کی؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ الحاد جدید کی لہر متعدد ملکوں کی بڑی تعداد کو اب بھی متاثر کر رہا ہے۔[2]

'پیو ریسرچ سینٹر' کے ۲۰۱۲ء کے سروے کی رپورٹ ہے: ''دنیا بھر میں تقریباً ہر چھ میں سے ایک فرد ملحد ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے بعد دنیا بھر میں یہ تیسرا سب سے بڑا گروہ ہے۔''

۲۰۱۲ء تک کی ان رپورٹس کو اور اس کے بعد آئندہ سالوں میں آزاد خیالی کی مسلسل بڑھتی رفتار

کو پیش نظر رکھیے، پھر اندازہ لگائیے کہ اب یہ مہلک مرض کس قدر عام ہو چکا ہے۔

'New Atheism' (الحادِ جدید) کی اصطلاح سب سے پہلے Jerry Wolf نے اپنے مقالے ''Believers-The Church of the Non'' میں استعمال کی ہے، جو ۲۰۰۶ء میں برطانیہ کے مجلّے 'Wired' میں شائع ہوا تھا۔[۳] لغوی اعتبار سے 'الحاد' انکارِ خدا کے معنی میں بولا جاتا ہے، وہیں سے یہ لفظ تمام اعتقادی انحرافات کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔

مذہب اور جدید سائنسی استدلال

سیم ہیرس نے اپنی کتاب The end of faith میں لکھا ہے: ''مذہب محض اندھے اور بے دلیل عقائد کا مجموعہ ہے، جو انسان کو لغو نظریات اور توہم پرستی سکھاتا ہے اور اس کی کوئی عقلی حیثیت نہیں۔''[۴]

اس نقطۂ نظر کا جائزہ لیا جائے تو اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں اس کی کچھ مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً: ہندومت میں دیومالائی داستانیں، بدھ مت میں خیالِ نروان، جین مت میں روح پرستی، سکھ مت میں پنج ککار، عیسائیت میں تثلیث اور یہودیت میں نسلی تصورِ نجات وغیرہ؛ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام عقل اور فطرت کی بنیاد پر قائم ہے۔ قرآن مجید اپنی دعوت عقلی و منطقی دلائل کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ عقل و تدبر سے کام نہ لینے والوں کی سخت مذمت کرتا ہے: إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لاَ يَعْقِلُونَ۔ (بدترین حیوانات اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں، جو عقل سے ذرا کام نہیں لیتے)۔ (انفال:۲۲) اسی لیے قرآن مجید کا نام 'برہان' بھی ہے، جو دراصل عقلی و استدلالی پہلو کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُوراً مُّبِيناً۔ (اے لوگو! تمہارے پاس یقیناً ایک دلیل تمہارے پروردگار کے پاس سے آچکی ہے اور ہم تمہارے اوپر ایک کھلا ہوا نور اتار چکے)۔ (نساء:۱۷۴)

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب کا چوں کہ خارج میں مظاہرہ نہیں کیا جاسکتا؛ اس لیے وہ محض ذاتی عقیدہ کی چیز ہے۔ دوسری طرف فلسفیوں اور سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ جدید دریافتوں نے مذہبی عقائد کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اگر واقعی ایسی چیز ہے، جس کو دوسرے کے سامنے علمی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا، تو اس کا علمی رد کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یعنی جب مذہب کا اثبات دائرے سے باہر ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں ہے، تو اس کا رد کرنا بھی ناممکن ہونا

چاہیے۔ ورنہ اس دعویٰ پر اجتماع متنافیین لازم آتا ہے، جو کہ محال ہے؛ اس لیے یہ دعویٰ ہی عبث ہے۔

عام طور پر غیبیات یعنی ذات باری تعالیٰ، قضاوقدر، حیات بعدالممات اور جنت ودوزخ وغیرہ کو عقل پرست بے دلیل کہتے ہیں، وہ انھیں نا قابلِ مشاہدہ ہونے کی وجہ سے خلافِ عقل مانتے ہیں اور نا قابلِ یقین قرار دیتے ہیں؛ جب کہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی چیز کا ماورائے فہم ہونا، اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی؛ جب تک کسی چیز کے محال ہونے پر قطعی دلیل نہ ہو، وہ ممکنات میں سے رہتی ہے، کسی شے کے موجود ہونے کے لیے اس کا قابلِ محسوس اور لائقِ مشاہدہ ہونا بھی لازم نہیں ہے۔ حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے:

''منقولاتِ محضہ پر دلیل عقلی محض قائم کرنا ممکن نہیں؛ اس لیے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں۔ (جیسے کہ) تاریخ کی بنا نقل پر ہے؛ بلکہ یہ کہہ دینا بھی غلط نہ ہوگا کہ (یہاں پر) عقل کو کوئی دخل نہیں۔ مثلاً: فلاں جگہ فلاں چیز کا کارخانہ ہے۔ بعض ناسمجھ کہتے ہیں کہ جو چیز محسوسات سے معلوم ہو، اس کے مطابق کرنا عقل کے مطابق کرنا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو چیز صحیح ذریعہ سے معلوم ہو، اس پر عمل کرنا عقل کے مطابق کرنا ہے اور ذریعۂ صحیحہ میں نقل بھی شامل ہے۔''(۵)

سب مانتے ہیں کہ کائنات میں اکثر چیزیں جاندار ہیں؛ لیکن جان کا براہِ راست مشاہدہ کسی نے نہیں کیا۔ جب جان نکل جاتی ہے تو ذی روح مرجاتا ہے اور بچا کھچا ڈھانچہ بے جان شے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ غور کریں کہ جس طرح ہم پانی کی بوتل سے پانی نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں، اسی طرح کسی ذی روح کے مرتے وقت اُس کے جسم سے جان نکلتے ہوئے نہیں دیکھتے؛ لیکن اس عدمِ مشاہدہ کے باوجود نہ کوئی 'جان' کا انکار کرسکتا ہے اور نہ 'جان کے نکلنے' کا۔ یہاں سائنس کس انسانی حواس اور کس مشاہدہ کی بنیاد پر اس قبولِ عام مسئلے کی توجیہ کرے گی؟

ایسے بے شمار مسائل ہیں، جن میں سائنسی نقطۂ نظر کو محض عقلی استدلال کی وجہ سے مان لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفعتؒ نے اپنی کتاب میں انکارِ غیب کے دلائل کا جائزہ لیا ہے، جس کے نتیجے کا خلاصہ یہ ہے کہ انکارِ غیب کا موقف درحقیقت بہت کمزور ہے اور اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل موجود نہیں ہے؛ اس لیے نبی ﷺ نے جو کلامِ الٰہی انسانوں کے سامنے پیش کیا، اس میں انکارِ غیب کی اس دلیل (عدم مشاہدہ) کی کسی تردید کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی؛ البتہ اس امر کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ انسانوں کا موت پر قابو نہ پاسکنا عالمِ غیب کی موجودگی پر صاف دلالت کرتا ہے:

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَكِن

لَّا تُبْصِرُون (جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اُس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اُس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں؛ مگر تم کو نظر نہیں آتے) (واقعہ: ۸۳-۸۵)(۶)

اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ عقلیت پرستوں کی بنیاد تجربات پر ہے؛ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد کی تحقیقات نے اس فلسفے کو یکسر مسترد کر دیا ہے، آج کی فزکس (علم طبیعیات) محسوسات کے تنگ دائرے سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ آج ایسی چیزیں جو لائق مشاہدہ تو نہ ہوں؛ لیکن اس کے کچھ اثرات تجربہ میں آئے اور قیاس ممکن ہو کہ کوئی حقیقت پائی جارہی ہے تو یہ بھی ایک صحیح معیارِ استدلال ہے۔ مثلاً 'اِنرجی' اور 'الکٹران' وغیرہ جو ایک مفروضہ ہے؛ مگر اس کی بنیاد چوں کہ بالواسطہ تجربہ پر ہے؛ اس لیے سائنس اسے تسلیم کرتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذہب کا تعلق استنباطی استدلال سے ہے؛ اس لیے اس کا مطالعہ استنباط کے منطقی اصولوں پر کیا جانا چاہیے، جس طرح کہ جدید سائنس کائنات سے متعلق تحقیقات میں بہت سے ناقابلِ مشاہدہ امور کو معقول سمجھتی ہے اور قبول کرتی ہے۔

مذہب اور سائنس کی حقانیت

نئے افکار اور جدید ذہنوں میں پائے جانے والے خیالات میں سے ایک مشہور خیال یہ ہے کہ مذہب صرف ایک دعویٰ اور عقیدہ ہے؛ کیوں کہ اس کی صداقتوں کا خارج میں مظاہرہ ممکن نہیں، اس لیے مذہب سائنسی قطعیت تک رسائی حاصل کر ہی نہیں کرسکتا۔ دوسری طرف سائنس پہلے تصورات کو تجربہ گاہوں سے گزارتی ہے، پھر اس کی حقیقت کو ثابت کرتی ہے، اس کے بعد ہمیں حقائق سے آگاہ کرتی ہے؛ اس لیے سائنس یقینی ہے اور مذہب غیر یقینی۔ مطالعۂ مذاہب اور علمِ الٰہیات کے ماہر ڈاکٹر پال بیدھم نے اپنے مقالہ کے اندر اس خیال کی تائید میں لکھا ہے:

''مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے میں اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ایمان کو کبھی بھی سائنسی علم والی قطعیت کے درجے پر نہیں رکھا جاسکتا۔''(۷)

حالاں کہ سائنسی علوم کی قطعیت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کا آغاز ہی مفروضات سے ہوتا ہے، پھر مشاہدات و تجربات کی راہ سے ہو کر ابتدائی مفروضے کو سائنسی اعتبار سے معقول ٹھہرایا جاتا ہے، پھر بھی یہ معقولیت قطعی ہونے کے بجائے امکان کی حیثیت رکھتی ہے؛ کیوں کہ سائنسی تصورات میں خود سائنس داں بھی عدمِ قطعیت کا اقرار کرتے رہے ہیں اور ان کے

نزدیک عدم قطعیت ہی سائنسی علوم کے ارتقا کا سبب ہے۔

ماہر فزکس، معروف محقق ومصنف Carlo Rovelli نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا ہے:

''سائنس کوئی حتمی چیز نہیں ہے؛ بلکہ علم کی موجودہ سطح پر سوچنے کا سب سے قابلِ اعتماد طریقے کی کھوج سے عبارت ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ سائنس بہت قابل اعتماد ہے؛ لیکن کوئی حتمی اور اٹل شئ نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کی بنیاد میں قطعیت کی کمی ہے۔ اسی طرح سائنسی نظریات اس لیے قابل اعتبار نہیں ہیں کہ وہ یقینی ہیں؛ بلکہ اس لیے قابل اعتبار ہیں، کیوں کہ وہ ماضی کی تمام ممکنہ تنقیدوں سے بچ نکلے ہیں۔ وہ اس لیے بھی معتبر ہیں؛ کیوں کہ انھیں ہر ایک کی میز پر تنقید کے لیے رکھا گیا ہے۔''(۸)

دوسری طرف مذہب (اسلام) کا موضوع انسان اور کائنات ہے؛ اس لیے اسلام یقینی موقف پیش کرتا ہے۔ جہاں تک اس شرط کی بات ہے کہ کسی چیز کو اسی وقت قطعی تسلیم کیا جائے، جب وہ معقول تنقید پر پوری اترے، تو قرآن مجید خود بھی اسی کی طرف دعوت دیتا ہے کہ قرآن کی ہر اعتبار سے جانچ وتحقیق کرو اور اطمینان کے بعد اسے قبول کرو: أَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّهِ لَوَجَدُواْ فِيْهِ اخْتِلاَفاً كَثِيْراً (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی)۔ (نساء: ۸۲)

الحاد کے محرکات

الحاد کے بڑھنے کے اسباب سے واقفیت کے لیے سب سے پہلے ہمیں ان مذہبی افکار اور ان رویوں کا مطالعہ کرنا ہوگا، جو اس کے نشر وفروغ کے محرکات ہیں اور اس کے لیے یورپ کی مذہبی تاریخ کو لازماً پڑھنا اور سمجھنا ہوگا؛ تاکہ ہم اس کی پیدائش اور نمو کے اسباب کو جانیں اور ان غلطیوں کے دہرانے سے گریز کریں۔ تاریخ کے جائزہ سے الحاد کے فروغ کے بارے میں درج ذیل بنیادی عوامل سامنے آتے ہیں:

- مذہبی رہنماؤں اور پوپ صاحبان کا ایک طبقہ اخلاقی رذائل اور شدت پسندی کا شکار ہوگیا۔
- یہودی علماء بالخصوص فریسی مذہب(۹) اخلاقی وروحانی تعلیمات کی پیروی کے بجائے ظواہر پرستی میں مبتلا ہوگئے، ان کا سارا زور مذہب کی ظاہری ہیئت اور مذہبی حلیے کی بقا پر تھا۔ مذہب کی اصل روح کے اوجھل ہونے اور ظاہر پرستی کے رواج نے حساس ذہنوں کو مذہب کا مخالف بنادیا۔
- مذہبی اختلاف، تکفیری مہم اور باہمی فرقہ وارانہ کشمکش نے بھی اہم محرک کا کردار ادا کیا۔
- شریعت کی خودساختہ تفہیم کو دین کا درجہ دیا گیا اور اس سے اختلاف، مذہب سے اختلاف کی

مانند قرار پایا۔

• عیسائی متکلمین اپنے دین کا اثبات یونانی فلسفے کی مدد سے کرنے لگے تھے اور جب نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں یونانی فلسفے پر جرح کا آغاز ہوا تو لوگوں کا عیسائیت پر سے بھی ایمان متزلزل ہونے لگا۔

آج ہم اپنا جائزہ لیں اور غور کریں، تو یہ واضح ہو جائے گا کہ جن محرکات کے نتیجے میں ہم سے پہلے کی قومیں تنزل کا شکار ہوئیں، ہم بھی انھیں غلطیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں، جن میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو تباہ ہوئے۔ مثلاً: ہم اخلاقی پستی کا شکار ہو رہے ہیں، ہمارا ذہن فرقہ واریت سے آلودہ ہو چکا ہے، ہم روحِ اسلام اور مقاصد شریعت سے بیزار ہو رہے ہیں اور ظاہری خدوخال کے لیے خرد ماغی پر تلے رہتے ہیں۔ دین کی تفہیم پر ہونے والی تنقیدوں کو دین سے انحراف گردانے لگے ہیں اور کلامِ الٰہی کے اثبات کے لیے مسلسل بدلتی ہوئی سائنس کو بحیثیت معیار اختیار کرنے لگے ہیں۔ اگر ہم اسی روش پر چلے، وہی رویہ اختیار کیا، جو اس زمانے میں اہلِ کلیسا نے اختیار کیا تھا اور اسلام کی حقیقی اسپرٹ کو پسِ پشت ڈال دیا، تو نتیجہ ظاہر ہے۔

مذہب بیزاری کی وجوہات

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ افراد اور سماج کوتاہ عمل ہوتے ہیں، جسے دیکھ کر یا جس سے تنگ آ کر بعض لوگ مذہب سے متنفر ہو جاتے ہیں اور الزام مذہب کو دیتے ہیں۔ مذہب بیزاری کے چند بڑے وجوہ:

• سائنس کی ترقی کے بعد ہر واقعے کی توجیہ (Justification) تلاش کی جانے لگی۔ پہلے لوگ حادثات، مشکلات اور جو بات سمجھ سے بالاتر لگتی تھی، اسے مشیتِ خداوندی پر محمول کرتے تھے؛ مگر اس کے بعد واقعات کی توجیہ کے لیے سبب (Cause) کا حوالہ دیا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں مادہ پرستی (Materialism) عام ہوئی اور پھر تصورِ خدا کی ضرورت کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

• بسا اوقات مذہبی رہنماؤں کی جانب سے مذہب کی غلط تشریح ہو جاتی ہے، جنھیں بنیاد بنا کر مذہب کو باطل قرار دے دیا جاتا ہے۔

• کچھ لوگ بہت کچھ پڑھ کر بہتیرے جانکاری حاصل کر لیتے ہیں؛ مگر چوں کہ ان میں تجزیہ کی صلاحیت نہیں ہوتی، وہ جہانِ شبہات میں گم رہتے ہیں اور بالعموم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مذہب بیزار بن جاتے ہیں۔

• بعض اوقات ایک صاحبِ ایمان کسی مسئلہ میں سخت تردد کا شکار ہوتا ہے، بالآخر وہ معلوم و مشہود حقیقت کو ترجیح دیتا ہے اور پھر عقل پر شک کا عینک لگ جاتا ہے، جس کے بعد وہ بتدریج یہ موقف

اختیار کرتا ہے کہ مذہب غیر عقلی اور روایتی شے کا نام ہے؛ بالآخر وہ مذہب سے دور ہو جاتا ہے۔

• ماحول کے اثرات بالخصوص تعلیم، ادارہ جات اور اتالیق کی فکروں سے پہلوتہی محال سا ہوتا ہے اور جن کے اردگرد یہ چیزیں ہوتی ہیں، وہ بھی عموماً ان کے خیالات کے شکار ہو جاتے ہیں۔

• بعض لوگ وقتی فائدے یا صرف شہرت پانے کے لیے ملحد ہو جاتے ہیں۔

• بہت سے لوگ خواہشاتِ نفسانی کے غلام ہوتے ہیں اور مذہب چوں کہ اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے، لہٰذا وہ مذہب کی مخالفت پر تلے رہتے ہیں۔

تدارک کی حکمت عملی

یقیناً اِلحاد انسان کو فطری پکار اور طبعی تقاضوں سے دور کرتا ہے؛ کیوں کہ انسان جذبۂ پیروی سے سرشار ہوتا ہے اور جب اسے اصل خدا نہیں ملتا ہے، تو وہ اس کے عوض میں نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

جدید الحاد ایک فلسفیانہ اور سماجی رجحان ہے۔ جو خدا، مذہب اور مذہبی عقائد کی مخالفت پر مبنی ہے۔ یہ رجحان خاص طور پر نوجوان نسل میں بڑھ رہا ہے، جس کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں تشویش پیدا ہوئی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ اس کے تدارک کے لیے مختلف حکمت عملی اپنائی جاسکتی ہے:

• والدین اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دیں۔ بچوں کو ابتدائی عمر سے ہی مذہبی تعلیمات اور اخلاقی اقدار سکھائیں۔ گھر اور خاندان والے اسلامی طرزِ عمل اور اخلاقی قدروں کا عملی نمونہ پیش کریں، جنھیں دیکھ کر ان کے دل و دماغ میں مذہب کی عظمت بیٹھے گی۔

• تعلیمی اداروں کے نصاب میں دینی کتابیں شامل کی جائیں۔ بچوں میں سنجیدہ علمی، فکری، تنقیدی اور مذہبی بحث و مباحثے کی حوصلہ افزائی کی جائے؛ تاکہ نئی نسل مختلف نظریات کا تجزیہ کر سکے اور اپنے عقائد کو مضبوط بنا سکے۔

• علمائے کرام اور مذہبی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جدید الحاد کے نظریات کا علمی اور منطقی جواب دیں۔ اپنی تقریر و تحریر میں معقولیت اور دلائل پر مبنی گفتگو کریں۔ اہلِ علم جدید دور کے مسائل، جیسے سائنسی ترقی، اخلاقی اقدار اور سماجی مسائل پر خوبصورتی سے مذہبی نقطۂ نظر پیش کریں؛ تاکہ نوجوان نسل میں مذہب کی اہمیت واضح ہو، انھیں ذہنی تسکین ملے اور عقلی طمانیت حاصل ہو۔

• اب جب کہ فزکس نے اپنا دائرہ وسیع کیا ہے، ہمیں بھی طبعیات و مابعد الطبعیات پر گفتگو کے دوران دینی دلائل کے بعد سائنسی بنیاد پر اپنی بات کو مزید مؤکد کرنا چاہیے؛ کیوں کہ دنیا ہر چیز کو

سائنسی نظریے سے دیکھنے اور سننے کی عادی ہو چکی ہے۔ جوں ہی آپ یہ بتائیں گے کہ یہ بات ایک سائنسی مسلمہ کی حیثیت سے بھی تسلیم کر لی گئی ہے، تو جلد اور بآسانی قبول کیے جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں؛ البتہ شرعی نصوص کے دلائل کو اصل کے طور پر مقدم رکھا جائے۔

- علمی طور پر یہ واضح کیا جائے کہ سائنس کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کے ذریعہ خدا اور مذہب کو پرکھا جائے؛ بلکہ مذہب سائنس کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔
- فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی خدا کے وجود (Exist) اور مذہب کی اہمیت پر دلائل پیش کرنا لازم ہے۔ جس کے لیے مشہور فلسفیوں کے نظریات اور دلائل کا استعمال کر کے جدید اِلحاد کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔
- سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر علمی مکالمے (Dialogues) کیے جائیں، مثبت اور معقول مذہبی مواد کی نشر واشاعت کی جائے، جہاں مذہبی نظریات پر تعمیری بحث ہو۔ آڈیوز، ویڈیوز اور مضامین وغیرہ کے ذریعے فکری انحراف کے شکار افراد کو مذہب کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔

جدید الحاد کے تدارک کے لیے مختلف حکمت عملی اور طریقۂ کار کا استعمال ضروری ہے۔ گھریلو تربیت، تعلیمی اصلاحات، مذہبی رہنماؤں کا کردار، میڈیا کا استعمال، سائنسی اور فلسفیانہ دلائل کے ذریعے نظریۂ اِلحاد کا مؤثر جواب دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہم اپنی نسلوں کو مذہب کی حقیقت اور اس کی اہمیت سے آگاہ کر سکتے ہیں اور ان کے عقائد کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔

خلاصہ

اسلام نہ صرف مذہبی معاملات میں رہنمائی فراہم کرتا ہے؛ بلکہ علمی اور سائنسی ترقی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ تاریخی طور پر بھی مسلم دنیا میں سائنس دانوں اور محققین کی ایک طویل فہرست موجود ہے، جنھوں نے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس طرح اسلام اور سائنس کے درمیان ایک مضبوط اور متوازن تعلق موجود ہے۔

دیکھا جائے تو مذہبی استدلال اور سائنسی استدلال دونوں ہی یکساں طریقے سے اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں؛ البتہ سائنسی تصورات ہمیشہ کسی نہ کسی درجے میں مشکوک رہتے ہیں اور مستقل بدلتے رہتے ہیں؛ جب کہ مذہب الہامی کتاب کو بغیر شکوک وشبہات کے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے، جو ہر قسم کی تشکیک سے بالاتر ہوتا ہے۔

سائنس و مذہب کی تعریف اور موقف کے بیان سے واضح ہو گیا کہ ان دونوں کا تقابل کرنا ایک

بڑی غلطی ہے اور جس قطعیت کا مطالبہ مذہب سے کیا جاتا ہے، خود سائنس بھی اپنے نظریات میں اس قسم کی قطعیت سے محروم ہے؛ بلکہ سائنس تو مذہب کے درجۂ یقین کے قریب بھی نہیں ہے۔

❊ ❊ ❊

حواشی ومراجع

(۱) یہ اصطلاح ان لوگوں کے لیے مستعمل ہے، جو مانتے ہیں کہ خدا ہے، جس نے کائنات کی تخلیق کی، اس کے لیے مقررہ قوانین بنائے؛ لیکن اب وہ خود کو معطل کر کے آرام فرما ہے؛ لہٰذا کائنات کے نظام میں اب کسی ہستی کی مداخلت نہیں ہے؛ بلکہ یہ آٹو میٹک سسٹم سے چل رہا ہے۔

(۲) عبداللہ بن صالح العجیری، ملیشیا الالحاد-مدخل لفهم الالحاد الجديد، مركز تكوين للدراسات والابحاث ۲۰۱۸ء، ص۱۰۔

(۳) محولہ بالا، ص۱۷۔

(۴) Sam Harris, The end of faith, W.W. Norton &Company, New York London, Page 23

(۵) مولانا اشرف علی تھانویؒ، الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ، مکتبۃ البشریٰ، کراچی پاکستان ۲۰۱۱ء، ص۲۲۔

(۶) ڈاکٹر محمد رفعت، عصر حاضر کے پرفریب نعرے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص۱۶۔

(۷) یہ مقالہ ۱۹۹۲ء میں مانچسٹر کالج آکسفورڈ کے تحقیقی جرنل Faith and Reason کے شمارہ نمبر ۱۳۴ میں شائع ہوا تھا۔

(۸) Carlo Rovelli کا یہ آرٹیکل ۲۱ جولائی ۲۰۱۴ء کو 'Science is not about certainty' کے عنوان سے 'The new republic' میگزین میں شائع ہوا تھا۔

(۹) یہ فریسی مذہب ۱۶۷ قبل مسیح میں یہودیوں کے اندر ایک سیاسی وسماجی تحریک کے طور پر اٹھی تھی، جو بعد میں ایک مکتب فکر کی شکل اختیار کر گیا۔ (ویکی پیڈیا)

❊ ❊ ❊

علامہ شبلیؒ کی کتاب: ''الکلام'' کا مطالعہ

بہ قلم: مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

علامہ شبلی نعمانیؒ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، علی گڑھ میں سرسید احمد کے ساتھ بھی رہے، متعدد علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی موضوعات پر انھوں نے کتابیں تصنیف کیں، جن اہلِ قلم نے اپنے عقیدت مندوں کا ایک حلقہ بنایا؛ اُن میں نمایاں مقام علامہ شبلی نعمانیؒ کو حاصل ہے، راقم حروف نے علامہ کی الفاروق، سیرت النعمان، شعرالعجم، موازنۂ دبیر وانیس وغیرہ کو پڑھا تھا؛ مگر ''علم الکلام'' کو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور نہ پڑھنے کی وجہ اپنی سستی اور کاہلی تھی، یہ سوچتا تھا کہ عقائد کی بحث دقیق ہوگی، کبھی فرصت سے پڑھوں گا، اتفاق سے علم عقائد وکلام پر دوسری کتابوں کے ساتھ علم الکلام کے مطالعہ کا بھی ایک حسین موقع نصیب ہوا کہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود عقائد کی ساری اردو کتابیں پڑھنے اور حاصل مطالعہ لکھنے کا موقع رب العالمین نے عنایت فرمادیا، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں اس کی دوجلدیں موجود ہیں۔

پہلی جلد انوارالمطالع لکھنؤ سے چھپی ہے اور دوسری جلد ۱۹۰۶ء کو عمدۃ المطابع لکھنؤ سے، پہلی جلد ''علم الکلام'' کے نام سے چھپی؛ جب کہ دوسری جلد ''الکلام'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، پہلی جلد میں علم الکلام کا تعارف اور اس کی تاریخ ہے، اس کے ارتقائی مراحل کو بھی خوب لکھا ہے، علم کلام کی وسعت اور اس کے تغیرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور دوسری جلد میں مصنف نے اسلامی عقائد کو موضوع بنایا ہے اور فلسفۂ حال سے اس کا تقابل نہایت ہی بسط وتفصیل سے پیش کیا ہے۔ تیسری جلد کے بارے میں انھوں نے خود فرمایا کہ اس میں ''علم القرآن'' کو بیان کروں گا، عبادات واخلاق کو بھی بیان کروں گا۔ تیسری جلد کی زیارت راقم حروف کو نہ ہوسکی، ہوسکتا ہے کہ تصنیف کی نوبت نہ آئی ہو۔

تینوں جلدوں کے موضوع پر جب بھی کوئی قاری غور وفکر کرے گا تو اُسے یہ سمجھ میں آئے گا کہ پہلی اور تیسری دونوں جلدیں موضوع سے باہر ہیں؛ اس لیے کہ پہلی میں ''تاریخ'' کا بیان ہے اور تیسری میں ''علوم القرآن'' کا؛ دونوں کو اصل ''علم الکلام'' سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، دونوں مستقل حیثیت کے حامل ہیں، ایک کا تعلق فنِ تاریخ سے ہے تو دوسرے کا تعلق ''علوم القرآن'' سے۔

پہلی جلد پر گفتگو

غرض یہ کہ ''علم الکلام'' کی پہلی جلد میں پہلے موضوع کا تعارف کرایا گیا ہے، وجہ تسمیہ پر گفتگو ہوئی ہے، علم کلام کی وسعت اور رفتہ رفتہ اس میں ہونے والے تغیرات بیان کیے گئے ہیں، تمہید میں اسلام کی آفاقیت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ''مسلمان کسی نسل، خاندان، ملک اور آبادی کے افراد کا نام نہیں ہے۔'' (ص۱) پھر عباسی دور میں یونانی اور فارسی علوم کے تراجم کی دلچسپ تاریخ بیان فرمائی ہے، پارسی، عیسائی، یہودی اور زنادقہ کی طرف سے اسلام کے خلاف اٹھنے والے سوالات اور ان کے اعتراضات کا ذکر ہے۔ (ایضاً)

پہلی جلد میں تاریخ درج کرنے کی دو وجہیں بیان کی ہیں: (۱) ''ایک'' یہ کہ اسلاف کے اصول سے واقفیت ہو اور ان سے رشتہ کٹ نہ جائے۔

(۲) ''دوسرے'' اشخاص واقوام کی تاریخ سے الگ رہ کر خالص علم کلام کی تاریخ لکھی جائے؛ تاکہ اردو ذخیرے میں نئے انداز کی تصنیف کا اضافہ ہو۔ (ص۳)

پھر ان کتابوں اور تصانیف کے نام دیے گئے ہیں جو اُس دور میں مرتب ہوئیں، مثلاً: ''مقالاتِ اسلامیین'' اور ''ملل ونحل'' ان میں سرفہرست ہیں۔ (ص۴)

معاصر تصانیف کے عیوب

علامہ شبلیؒ نے اپنی معاصر تصانیف پر نقد کرتے ہوئے ان کے دو عیوب لکھے ہیں:

۱- اشاعرہ کے ایجاد کردہ دلائل اور فرسودہ مسائل ان میں ہیں، علامہ نے اس روش کو ''کورانہ تقلید'' سے تعبیر کیا ہے۔

۲- یورپ کے معتقدات وخیالات کو حق مان کر مدلل کیا گیا ہے، یعنی قرآن وحدیث کو زبردستی کھینچ تان کر ان سے ملایا گیا ہے، اس انداز کو علامہ نے ''تقلیدی اجتہاد'' سے تعبیر کیا ہے۔ (ص۶)

پھر تاریخ لکھتے ہوئے تمہید میں لکھا ہے کہ ایک علم کلام وہ ہے جو اسلامی فرقوں کے ''باہمی جھگڑوں'' سے پیدا ہوا ہے اور دوسرا ''فلسفہ'' کے مقابلے میں ایجاد ہوا ہے، امام غزالی نے دونوں کو ملا دیا

اوررازی نے ترقی دی اور متأخرین نے فلسفۂ کلام اوراصولِ عقائد کو گڈمڈ اور خلط ملط کردیا۔(ص۶)

اختلاف عقائد کے اسباب

علامہ نے اختلافِ عقائد کے چھ اسباب بیان کیے ہیں:

۱- جب تک اسلام عرب میں تھا، اس وقت تک اجمالی عقیدہ کافی سمجھا گیا؛ لیکن جب اسلام میں ایرانی، یونانی اور قبطی قومیں داخل ہوئیں (اور عباسی دور میں یونانی فلسفے کا ترجمہ ہوا) تو نکتہ آفرینی شروع ہوئی۔(ص۷)

۲- نئے اسلام لانے والوں کو اپنے قدیم مذہب میں (توحید سے متعلق خاص طور سے) الگ الگ خیالات تھے۔

۳- ذو وجہت مسائل میں رائے کا اختلاف بھی اختلافِ عقائد کا باعث ہوا۔

۴- فلاسفہ اور غیر فلاسفہ کے اندازِ فکر نے اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف کو پیدا کیا۔

۵- عقل ونقل کی بحث سے بھی اختلاف پیدا ہوا۔

۶- اہلِ علم کا الگ الگ معاشرت اختیار کرنا، مثلاً محدثین اور فقہاء الگ الگ رہنے لگے، ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اس طرح ہر ایک اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اختلاف بڑھتا چلا گیا۔(ص۷،۱۱)

آگے ان باتوں کو مثالوں سے سمجھایا ہے۔(ص۱۱،۲۲) اس کے بعد علم کلام عقلی کا تعارف اوراس کی ابتدائی تاریخ بتائی ہے، یعنی عباسی دور کی تاریخ لکھی ہے۔(ص۲۳) علم کلام کی وجہ تسمیہ لکھی ہے کہ کلام الٰہی (کے مخلوق ہونے اور نہ ہونے) کا مسئلہ زیادہ اہم تھا؛ اس لیے سب کو علم کلام کہہ دیا گیا (ملل ونحل) علامہ شبلی کے نزدیک یہ صحیح ہے کہ علم منطق کلام کا مترادف ہے؛ اس لیے کہ دونوں میں نطق ظاہری وباطنی استعمال ہوتی ہے۔(ص۲۴)

آگے علم کلام کی مخالفت اوراس کے اسباب کا ذکر ہے، پھر علم کے بانی محمد بن الہذیل بن عبداللہ کا ذکر ہے۔(ص۲۶) مشہور متکلمین مثلاً ہشام بن الحکم، یحییٰ برمکی کے تعارف کے بعد مامون الرشید پھر اشاعرہ کے دور اوران کے عقائد کا ذکر ہے۔(ص۲۷،۶۸) پھر ابن رشد، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کا ذکر ہے کہ ان سب نے بحث شروع کی کہ انسان کیوں مکلّف ہے؟ روح کی حقیقت، جزا وسزا کی حقیقت، نبوت کی ضرورت، اختلاف شرائع کے اسباب کے ساتھ عالم مثالی کی بحث چھیڑی ہے اوران لوگوں نے علم کلام کو آگے بڑھایا ہے۔(ص۸۲) پھر حکمائے اسلام، ابن مسکویہ کے کارنامے لکھے ہیں۔ (ص۸۸) نبوت اور وحی کی حقیقت وماہیت لکھنے کے بعد ملاحدہ کے

اعتراضات کا جواب دینے میں اشاعرہ کے اسلوب پر نقد کیا ہے کہ انھوں نے قدیم اسلوب اختیار کیا، اسی پر یہ جلد پوری ہوئی ہے۔ (ص ۱۴۷)

علامہ شبلی کا مسلک ومشرب

علامہ شبلیؒ اپنے نام کے ساتھ ''نعمانی'' لکھتے تھے، یہ ابتدائی زمانے میں حنفیت پر تصلب کی وجہ سے تھا، آبا، واجداد کے لحاظ سے بھی حنفی تھے؛ مگر سرسید احمد کی صحبت نے انھیں حنفیت میں کمزور کرنے کے ساتھ اشعریت وماتریدیت سے بھی متنفر کردیا؛ چنانچہ انھوں نے اشاعرہ اور ماتریدیہ پر نقد کرنے کے ساتھ معتزلیت کی طرف اپنا رخ کرلیا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے والد محترم مولانا عبدالحئی مرحوم ''نزہۃ الخواطر'' میں (ص ۱۲۴۱ پر) لکھتے ہیں: ''كَانَ معتزليًا في الأصول، شديدَ النكير على الأشاعرةِ'' ترجمہ: (علامہ شبلی) اصول (عقائد) میں معتزلی تھے، اشاعرہ پر سخت نکیر کیا کرتے تھے۔

دوسری جلد

''الکلام'' کے نام سے دوسری جلد ہے، اس کے لوح پر لکھا ہے: ''علم کلام جدید جس میں اسلام کے تمام عقائد کو فلسفۂ حال کے مقابلے میں نہایت بسط وخوبی کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔''

دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''مذہبِ اسلام تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے، عقائد، عبادات اوراخلاق'' (ص ۱) معلوم نہیں موصوف نے معاملات اور معاشرت کو کیوں چھوڑ دیا؟ آگے لکھتے ہیں کہ عقائد میں ''اصل الاصول'' دو ہیں: وجود باری اور نبوت (ص ۱) معلوم نہیں آخرت وغیرہ کو کیوں چھوڑ دیا؟ حالاں کہ قرآن مجید نے اس پر بہت زور دیا ہے، مشرکین زیادہ اسی کے انکار کی بحث کرتے تھے۔ شروع میں امام غزالی کی تصانیف کا ذکر ہے، یعنی رسالہ قدسیہ، الاقتصاد فی الاعتقاد، تہافتہ الفلاسفہ، مستظہری (باطنیہ کے رد میں) حجۃ الحق، قاصم الباطنیہ، المفصل للخلاف في الاصول الدين وغیرہ، پھر لکھا ہے کہ امام غزالی نے توحید، صفات باری تعالیٰ، افعال اور قیامت کے عقائد کو احیاء علوم الدین میں بیان کیا ہے۔ (ص ۴)

جدید علم کلام کے مرتب کی ذمہ داری

علامہ شبلی کی جدت طرازی کا مطلب یہ تھا کہ معتزلہ اور منحرف فرقوں کی جو باتیں اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ نے نہیں لی ہیں ان سب کو لیا جائے اور وقفِ عام کردیا جائے، فرماتے ہیں:

''بزرگوں نے جن خزانوں کو سربہ مہر رکھا تھا، ان کو وقف عام کردے۔'' (ص ۶) پھر شاہ ولی اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسلام کو سائنس سے کوئی خطرہ نہیں، فلسفۂ جدیدہ اسلام کی مؤید ہے

مخالف نہیں۔ (ص ۱۵) خدا کا اعتراف، عبادت کا میلان، معاد کا خیال، جزا وسزا کا یقین، نبوت کا اعتراف لازمۂ انسانی ہے، یعنی مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، یہ بحث پڑھنے کے لائق ہے۔ (ص ۱۶، ۲۲) مذہب اور عقل کی بحث دلچسپ ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ دنیا کے مذاہب عقل کی مداخلت کی تعلیم سے بچاتے ہیں؛ جب کہ قرآن نے غور وفکر کی تعلیم دی ہے۔ (ص ۲۶، ۲۹) علامہ نے وجود باری کی بحث میں ارسطو، بوعلی بن سینا کا طریقۂ استدلال، متکلمین اور قرآن مجید کا استدلال ذکر کیا ہے اور مادہ پرستوں اور ملحدوں کے اعتراض کا جواب دیا ہے۔ یہاں شاہ ولی اللہ کا حوالہ بھی پیش فرمایا ہے۔ (ص ۳۰، ۴۸)

آگے توحید اور نبوت کی بحث ہے، نبوت اور معجزات کو مفصل بیان کیا ہے۔ (ص ۶۴، ۱۰۵) انبیاء کی تعلیم اور ہدایت کے طریقے کو بیان کیا ہے اور اس کے چھ اصول لکھے ہیں یہ اصول امام رازی کی ''مطالب عالیہ'' ابن رشد کی ''کشف الادلہ'' اور حضرت شاہ ولی اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے لیے ہوے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- انبیاء اپنی تعلیم میں عوام کو زیادہ مدنظر رکھتے ہیں۔

۲- انبیاء عام عقل انسانی کو خطاب کرتے ہیں، خواص کی عقل کو نہیں، جو مجاہدہ اور ممارست سے حاصل ہوتی ہے۔

۳- انبیاء تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

۴- انبیاء اپنی قوم کی معاشرت کو سامنے رکھتے ہیں، کھانے، پینے، لباس، مکان، نکاح، خرید وفروخت وغیرہ میں۔

۵- انبیاء پر نازل ہونے والی شریعت کے دو حصے ہوتے ہیں، اصول کلیہ، مثلاً توحید، آخرت، دوسرے جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔

۶- انبیاء نے امر ونہی کے دو طریقے اپنائے ہیں، یا تو فائدے اور نقصانات بیان کردیے یا اس کے ثواب یا سزا کو بیان کردیا۔ (ص ۱۰۵، ۱۱۱)

اس کے بعد علامہ نے خرق عادت اور معجزات کی بحث کی ہے اور اس میں منکرین کے مستدلات بھی ذکر کیے ہیں، یورپ کے اہلِ علم کی رائیں بھی لکھی ہیں، اخیر میں بوعلی بن سینا کی رائے لکھ کر اشاعرہ کی تردید کی ہے کہ اشاعرہ نے جو خرق عادت کے مفہوم کو وسعت دی ہے، اس کا سرا محالات سے مل جاتا ہے۔ (ص ۱۳۰)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے کمالات کو بیان کیا ہے، پھر آپ کی تعلیمات کا ذکر ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حق انسانی، عورتوں کے حقوق، وراثت، غیر مسلموں کے حقوق، پھر قرآن مجید میں موجود عقائد، وحی، ملائکہ، حشر، جنت، دوزخ، صراط اور میزان وغیرہ کو ذکر کیا ہے، قرآن مجید میں مال و دولت کی حیثیت کے بیان پر کتاب ختم ہے۔ (ص ۲۴۳) پھر عربی زبان میں ''مطالب عالیہ'' امام رازی سے ''قسم ثانی'' کو ضمیمہ کے طور پر شامل کیا ہے۔ پھر اس کا خلاصہ اردو زبان میں درج فرمایا ہے۔

علامہ شبلیؒ کا رد

علامہ شبلیؒ نے معتزلہ اور دیگر فرق باطلہ کی عبارتوں کو ''الکلام'' میں نقل کیا ہے اور اپنے اعتقاد کو منحرف فرقوں کے اعتقاد سے ملا دیا ہے؛ اس لیے ان کی زندگی میں متعدد اہلِ علم نے ان پر رد کیا تھا، مولانا عماد الدین شیر کوٹی اور مولانا انوار اللہ شاہ قادری حیدرآبادی بانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد وغیرہ کی تصانیف میں ان پر رد ملتا ہے۔ مولانا شیر کوٹی نے ''علامہ آخر الزماں'' کے نام سے سولہ صفحے کا ایک رسالہ ترتیب دیا ہے جو ''تحفۂ ہند پریس'' دہلی سے سن ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا تھا، اس میں موصوف کی کتاب الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم وغیرہ سے جلد اور صفحہ کی صراحت کے ساتھ ان کی قابلِ اعتراض عبارتیں نقل کی ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کو گمراہ قرار دیا ہے، مولانا انوار اللہ شاہ صاحب نے بھی مولانا شیر کوٹی کی تائید کی تھی ان میں سے چند قابل اعتراض باتیں ذکر کی جاتی ہیں:

۱- علامہ شبلی مادہ کو کسی طرح فانی نہیں مانتے تھے۔ (الکلام ۲/۳۰) اور مادہ کے ساتھ حرکت کو بھی قدیم مانتے تھے۔ (الکلام ۲/۴۷)۔

۲- وہ یہ کہتے تھے کہ عوام کے معتقدات اور ہیں اور خواص کے اور (الکلام ۲/۲)

۳- وہ عالم کو مادے کے لحاظ سے حادث نہیں مانتے تھے۔ (الکلام ۲/۳۰، ۴۴)

۴- وہ ملائکہ کے وجود خارجی کے منکر تھے۔ (سوانح مولانا روم ص ۱۲۵)

۵- عذاب وثواب کو عقلی مانتے تھے حسی نہیں۔ (الکلام ۲/۴۰، ۴۱، ۱۳۹)

۶- حضرات اشاعرہ کی توہین کرتے تھے۔ (الکلام ۲/۸۳، سوانح مولانا روم ۱۵۲، الغزالی ص ۱۸۰)

۷- موصوف اشیاء کا خالق تو اللہ کو مانتے ہیں؛ مگر اس کے لوازم کے بارے میں کہتے ہیں:

''لوازم انواع خود بخود پیدا ہوگئیں، خدا نے پیدا نہیں کیا۔'' (الکلام ۲/۴۷، ۴۹)

۸- وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''خدا کے وجود کی ضرورت صرف اس لحاظ سے ہے کہ نظام عالم کا

سلسلہ کس بنیاد پر قائم کیا جائے؟'' (الکلام ۲/۴۴)

یہاں چند ہی معتقدات نقل کیے گئے ہیں، تفصیل ''علامۂ آخرالزماں'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ علامہ شبلیؒ کی ''علم الکلام اور الکلام'' کے مطالعے سے ان کے سلسلے میں جو عقیدت تھی وہ خاک میں مل گئی، دوسری جلد میں ان کی محنت کا محور ہی یہ ہے کہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کے عقائد سے متصادم عقائد کو سامنے لایا جائے، جن باتوں کو امت نے بالاتفاق رد کردیا ہے، یا کم از کم مرجوح قرار دیا ہے اُن کو موصوف نے مَنَصَّۂ شُہود پر لاکر رکھ دیا ہے، اس سے چاہے مطالعہ کرنے والوں کو نیا مواد مل گیا؛ مگر در پردہ اہل حق کی مخالفت ہوگئی، وہ خود کہیں کے نہ رہے اور ان کا عقیدت مند قاری بھی گمراہی سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کے بارے میں ''نزہۃ الخواطر'' (ص ۱۲۴۱) کی بات ہی آخری ہے کہ وہ عقائد میں معتزلی تھے، اشاعرہ سے متنفر تھے، اشاعرہ پر شدید نکیر کرنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔

ہم قارئین کو مشورہ دیتے ہیں کہ اُن کے عقائد ہرگز نہ پڑھیں؛ ورنہ عقیدے کی لوٹیا ڈوب سکتی ہے۔ فاللّٰہ خیر حافظاً وَھُو أرحم الراحمین.

* * *

خوش نما لباس میں عبادت
اور ننگے سر نماز پڑھنے کی شرعی حیثیت

از: مولانا عبداللطیف قاسمی
جامعہ غیث الہدی، بنگلور

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یَا بَنِی آدَمَ خُذُوا زِینَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ -الخ- (الاعراف:۳۱)

اے آدم کی اولاد! تم مسجد کی ہر حاضری (یعنی عبادت) کے وقت زینت اختیار کرو۔

خارجِ نماز ستر پوشی فرض

ہر مرد وعورت کے لیے جب وہ کسی دوسر یا انسان کے سامنے جائے، تو اس کے لیے نماز اور نماز کے علاوہ اوقات میں بھی ستر پوشی فرض ہے، مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک اور عورت کے لیے نماز کا ستر سارا بدن ہے، چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور قدم نماز کے ستر سے مستثنیٰ ہیں، (عورت کے لیے غیر نماز میں محارم وغیر محارم کے لیے مخصوص احکام ہیں)

ستر عورت کی مقدار سے کم لباس میں نماز ادا کی جائے، تو نہ مرد کی نماز ہوگی نہ عورت کی نماز، مرد کے لیے ناف سے نیچے کے حصے پر ران اور گھٹنوں پر کپڑا نہ ہوا، تو خود گناہ گار ہوگا، اس لباس میں نماز بھی نہیں ہوگی، اسی طرح عورت کا سر، گردن، بازو، پنڈلی کھلی ہو، تو ایسے لباس میں غیر محارم کے سامنے آنا حرام ہے اور نماز بھی صحیح نہیں ہوگی۔

ایک کپڑے میں نماز

اگر کوئی شخص صرف ایک کپڑے میں نماز ادا کرے، تو نماز ہو جائے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑے میں نماز ادا فرمائی ہے۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ فی الثوب الواحد:۳۵۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک ہی تہبند میں نماز پڑھی، گردن کے پیچھے سے اس تہبند کی گرہ لگا رکھی تھی؛ حالاں کہ ان کے کپڑے ایک کھونٹی پر لٹکائے ہوئے تھے، اس پر کسی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: آپ ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے ہیں؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا: ہاں، میں نے صرف ایک تہبند میں نماز پڑھی ہے؛ تاکہ تجھ جیسا احمق مجھے دیکھے (اور وجہ معلوم کرے، تو میں اس کے سامنے مسئلے کی وضاحت کروں، طلب وتجسس کے بعد جو مسئلہ معلوم ہوتا ہے، وہ زیادہ یاد رہتا ہے) پھر حضرت جابرؓ نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم میں سے کون تھا جس کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے؟ (یعنی تنگ دستی وفقر کا زمانہ تھا، اکثر لوگ ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے تھے، لہٰذا یہ صورت جائز ہے) (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ فی الثوب الواحد: ۳۵۲)

حضرت جابرؓ کی حدیث سے دو مسئلے معلوم ہوئے: (۱) مجبوری میں صرف ایک کپڑا جو ستر عورت کے بقدر ہو اس میں میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ (۲) حضرات صحابہ اور تابعین کے زمانے میں کچھ وسعت آ گئی تھی، صرف ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھنے کو اسلامی معاشرے میں معیوب سمجھا جا رہا تھا، اسی وجہ سے کسی نے حضرت جابرؓ پر اعتراض کیا۔

عام حالات میں نماز کے لیے خوش نما لباس

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بقدر استطاعت صاف ستھرا، عمدہ اور خوش نما لباس اختیار کرنا چاہیے، مسلمانوں کو چاہیے کہ جس علاقے میں جس زمانے میں ان کے عرف میں جس لباس کو زینت والا، ادب واحترام پر مشتمل لباس سمجھا جاتا ہے، اس کو پہن کر کے نماز پڑھیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کپڑے میں نماز (پڑھنے کا) مسئلہ دریافت کیا، (صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھنے سے ہو جائے گی یا نہیں؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَوَلِكُلِّكُمْ ثَوْبان ؟

کیا تم میں سے ہر ایک کو دو کپڑے میسر ہیں؟ (یعنی دو کپڑوں میں نماز پڑھنا یقیناً افضل ہے؛ لیکن ہر ایک کو دو کپڑے کہاں میسر ہیں؟ تنگ دستی ومجبوری میں ایک کپڑے میں نماز پڑھنا درست ہے)

پھر ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: جب اللہ وسعت دے، تو وسعت والا لباس پہن کر نماز پڑھو، آدمی کو چاہیے کہ اپنے پورے لباس کو پہنے، پھر لباس کی تفصیل

ذکر فرمائی۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلاۃ فی القمیص والسراویل: ۳۶۵)

حضرت ابونضرہ فرماتے ہیں:

حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک کپڑے میں نماز پڑھنا بھی جائز ہے، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایسا کیا کرتے تھے اور اسے معیوب نہیں سمجھتے تھے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے (اس عمل کی توجیہ بیان کرتے ہوئے) فرمایا: ایک کپڑے میں نماز اس وقت (بلا کراہت) درست تھی "اذا کان فی الثیاب قلة" جب کپڑوں کی قلت تھی، جب اللہ تعالیٰ نے وسعت عطا فرمادی، تو دو کپڑوں میں نماز پڑھنا مستحب اور صاف ستھرا کام ہے۔ (رواہ احمد من حدیث ابی بن کعب: ۲۱۲۷۶)

حضرت نافع فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مجھے ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، فرمایا:

اَلَمْ اَکْسِكَ ثَوْبَيْنِ؟ فَقُلْتُ: بَلَى. قَالَ: اَرَاَيْتَ لَوْ اَرْسَلْتُكَ إِلَى فُلَانٍ اَكُنْتَ ذَاهِبًا فِي هَذَا الثَّوْبِ؟ فَقُلْتُ: لَا، فَقَالَ: اللّٰهُ اَحَقُّ مَنْ تُزَيِّنُ لَهُ – اَوْ مَنْ تَزَيَّنْتَ لَهُ. (رواه عبد الرزاق فی مصنفه، باب مایکفی الرجل من الثیاب: ۱۳۹۱، والطحاوی فی شرح معانی الاثار، باب الصلاة فی الثوب الواحد: ۲۲۱٤)

کیا میں نے تمہیں دو کپڑے نہیں دئے؟ میں نے عرض کیا: ضرور آپ نے مجھے دو کپڑے عطا فرمائے ہیں، آپ نے فرمایا: تم بتاؤ، اگر میں تمہیں ایک کپڑے میں جس میں تم نے نماز پڑھی، فلاں شخص کے پاس بھیجوں، تو ان کے پاس جاؤ گے؟ میں نے عرض کیا: نہیں جاؤں گا، حضرت نے فرمایا: اللہ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم اس کے لیے زینت اختیار کرو۔ (جب تم ایک کپڑے میں ایک عام انسان کے پاس جانے سے شرم محسوس کرتے ہوئے، تو اس کپڑے میں اللہ کے سامنے کیسے کھڑے ہوجاؤ گے؟

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مقصد یہ ہے کہ جس لباس میں ہم لوگوں کے سامنے نہیں جاتے، اس لباس میں نماز پڑھنا بے ادبی ہے؛ لہٰذا شبینہ کپڑے (لنگی، نیٹ پتلون، ٹی شرٹ، لنگی بنیان وغیرہ) میں یا ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندؒ تحریر فرماتے ہیں:

نماز میں صرف ستر پوشی مطلوب ہی نہیں؛ بلکہ لباسِ زینت اختیار کرنے کا حکم ہے؛ اس لیے مرد

کو ننگے سر نماز پڑھنا، یا مونڈھے، یا کہنیاں کھول کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، خواہ قمیص ہی نیم آستین ہو، یا آستین چڑھائی گئی ہو، بہرحال نماز مکروہ ہے، اسی طرح ایسے لباس میں بھی نماز مکروہ ہے جس کو پہن کر آدمی اپنے دوستوں اور عوام کے سامنے جانا قابلِ شرم و عار سمجھے، جیسے کرتے کے بغیر صرف بنیان، اگرچہ پوری آستین بھی ہو، یا سر پر بجائے ٹوپی کے کوئی کپڑا یا چھوٹی دستی رومال باندھ لینا کہ کوئی سمجھ دار آدمی اپنے دوستوں، یا دوسروں کے سامنے اس ہیئت میں جانا پسند نہیں کرتا، تو اللہ رب العالمین کے دربار میں جانا کیسے پسندیدہ ہوسکتا ہے، سر، مونڈھے، کہنیاں کھول کر نماز کا مکروہ ہونا، آیت قرآنی کے لفظ ''زینت'' سے بھی مستفاد ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات سے بھی۔ (تفسیر معارف القرآن، سورۃ الاعراف: ۳۱، ۳/ ۵۴۴)

عام حالات میں ننگے سر نماز پڑھنا غیر اسلامی طریقہ

مسلمانوں میں ننگے سر رہنے کی عادت ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد شروع ہوئی ہے، عربوں میں انگریزوں سے تعلقات کے بعد اس کا رواج ہوا، ابتداءً یہ مغربی تہذیب صرف دفاتر، کالج اور بازاروں تک محدود تھی، مذہبی مجالس اور مسجدوں میں لوگ ننگے سر جانے کو معیوب سمجھتے اور اس سے احتراز کرتے تھے، جب طبیعتیں اس اجنبی و مغربی تہذیب سے مانوس ہوگئیں، تو یہ جدید تہذیب و کلچر ہی عادت اور عام فیشن بن گیا ہے، مسلمانوں میں بطور خاص جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں، ان میں ننگے سر نماز پڑھنے کا رواج بہت تیزی سے پھیل رہا ہے؛ اس لیے عوام الناس کو اس مسئلے کی طرف متوجہ اور آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔

عرب عام حالات میں ننگے سر نہیں رہتے تھے، ان کے لباس اور ان کی تہذیب میں عمامہ شامل تھا، کفار بھی عمامہ باندھا کرتے تھے، شریعتِ اسلامیہ نے اس تہذیب میں مزید تہذیب کرتے ہوئے ٹوپی کا اضافہ کیا ہے، گویا جو حضراتِ صحابہ عمامہ باندھتے تھے، وہ ٹوپیاں بھی زیب تن فرماتے تھے، لباس میں ٹوپی اور عمامے کو خاص اہمیت دی جاتی رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ احرام کی حالت میں سر ڈھانپنے کی ممانعت ہے؛ کیوں کہ عمامہ اور ٹوپی زینت میں شامل ہے، آج بھی عرب و عجم میں مسلمانوں کی تہذیب میں ٹوپی اور عمامہ کو لباسِ زینت میں شمار کیا جاتا ہے، اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: محرم کون سے کپڑے پہن سکتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قمیص، شلوار، عمامہ اور ٹوپی نہ پہنے الخ (رواہ البخاری فی حدیث طویل عن عبداللہ بن عمر، کتاب الحج، باب مالا یلبس المحرم من الثیاب: ۱۵۴۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر عام حالات میں بھی عموماً عمامہ رہتا تھا، نماز کی حالت میں بدرجۂ اولیٰ عمامہ ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ننگے سر نماز پڑھنا نہ حدیث صحیح سے ثابت ہے نہ حدیث ضعیف سے، موجودہ زمانے میں بھی مسلم معاشرے میں ننگے سر رہنا اور ننگے سر نماز پڑھنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے، تو ننگے سر نماز پڑھنا ارشاد خداوندی "خذو زینتکم" کے خلاف ہوگا۔

صحابۂ کرام اور صلحائے امت کا یہی معمول تھا، کبھی کبھار ننگے سر ہوجانا گناہ نہیں؛ البتہ مستقل طور پر ننگے سر رہنا شرعاً ناپسندیدہ اور خلافِ ادب ہے اور ننگے سر رہنے کو معمول اور فیشن بنالینا اسلامی تہذیب کے بالکل خلاف ہے، اگر کوئی غیروں کی مشابہت میں ننگے سر رہتا ہے، تو وہ گناہ گار بھی ہوگا۔

کاہلی، سستی اور لاپرواہی کی بنا پر ٹوپی کے بغیر ننگے سر نماز پڑھنا مکروہِ تنزیہی ہے، اس سے ثواب میں کمی ہوتی ہے؛ البتہ اگر کبھی غلطی سے ٹوپی ساتھ نہ ہو اور فوری طور پر کسی جگہ سے میسر بھی نہیں ہوسکی، تو اس صورت میں ننگے سر نماز پڑھنے کی وجہ سے کراہت نہیں ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عام حالات میں عمامہ باندھنا

رسول اللہ علیہ وسلم عموماً سر پر عمامہ باندھا کرتے تھے، عمامہ کے نیچے ٹوپی بھی ہوا کرتی تھی، آپ کے پاس سفید ٹوپی تھی، مسلم کی روایت کے مطابق فتح مکہ کے موقع پر آپ نے کعبۃ اللہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے خطبہ دیا۔ (رواہ مسلم عن جابر، کتاب الحج، باب جواز دخول مکۃ بغیر احرام: ۱۳۵۸)

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی سند سے صحیح مسلم، کتاب الطہارت میں ایک طویل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت سر پر عمامہ باندھتے تھے، حتیٰ کہ وضو فرماتے وقت بھی عمامہ سر پر ہوتا تھا۔ (رواہ مسلم، کتاب الطہارۃ، باب المسح علی الناصیۃ والعمامۃ: ۲۷۴)

امام بخاریؒ نے "صحیح بخاری" میں حضرت حسن بصریؒ کا اثر تعلیقاً نقل فرمایا ہے:

حضراتِ صحابہ موسم گرما میں اپنے عماموں کے کناروں پر سجدہ کرتے تھے۔ (رواہ البخاری، کتاب الصلوۃ، باب السجود علی الثوب، تعلیقا) یہ اثر مصنف عبدالرزاق میں موصولاً مروی ہے، اس اثر کا صریح مطلب یہ ہے کہ عام صحابہ نمازیں عمامہ باندھ کر پڑھتے تھے، ننگے سر نماز نہیں پڑھتے تھے۔

حضراتِ صحابۂ کرام میں حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عمار، حضرت ابوالدرداء، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت انس، حضرت براء بن عازب، حضرت واثلہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور

تابعین میں حضرت سالم، حضرت قاسم، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت شریح رحمہم اللہ کے بارے میں مشہور محدث امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانیؒ نے اپنی کتاب ''مصنف عبدالرزاق'' میں ان حضرات کے عمامہ باندھنے کی صریح روایات نقل فرمائی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کا ٹوپی پہننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفید ٹوپی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ سے ہم کلامی شرف حاصل ہوا، تو آپ نے زینت والا لباس زیب تن فرمایا تھا، جس میں ٹوپی بھی شامل تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے بات چیت فرمائی، اس وقت آپ کے بدن پر اُونی چادر، اونی جبہ، اونی پائجامہ اور اونی ٹوپی تھی۔ (ترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی لبوس الصوف: ۱۷۳۴)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہداء کی چار قسمیں ہیں: (۱) ایک وہ مومن جو جیدالایمان ہے، دشمن سے لڑتا ہے، اللہ سے کیا ہوا وعدہ سچا کر دکھاتا ہے، پھر شہید ہو جاتا ہے، (اس شہید کا رتبہ اتنا بلند ہوگا کہ) قیامت کے دن لوگ (اس کے رتبے کی بلندی کی طرف) اپنی آنکھیں اس طرح اٹھا کر دیکھیں گے، پھر عملاً اونچائی کی طرف اپنا سر اٹھایا؛ یہاں تک کہ ان کی ٹوپی گر گئی، راوی کہتے ہیں: مجھے معلوم نہیں کہ سر اٹھانے والے حضرت عمرؓ تھے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ (رواہ الترمذی عن عمر، کتاب الجہاد، باب فضل الشہداء: ۱۶۴۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہید کا مقام و مرتبہ بتانے کے لیے اپنا سر مبارک اٹھا کر دکھایا ہو، یا حضرت عمرؓ نے اپنا سر اٹھا کر دکھایا ہو، دونوں صورتوں میں کسی کا ٹوپی پہننا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ٹوپی پہنا کرتے تھے، حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس ایک خاص ٹوپی تھی جس کے اگلے حصے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کو لگائے رکھا تھا، جس کی برکت سے غزوات میں انھیں کامیابی ملتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہمارے اور مشرکین کے عماموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہم ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں، وہ بلا ٹوپی عمامہ باندھتے ہیں۔ (رواہ ابوداود، کتاب اللباس، باب العمائم: ۴۰۳۸، والترمذی، کتاب اللباس، باب العمائم علی القلانس: ۱۷۸۴، وقال ھذا حدیث غریب)

غیر مقلد علمائے کرام کے نزدیک بھی ننگے سر نماز پڑھنا ناپسندیدہ

عالم عرب و ماضی قریب کے مشہور غیر مقلد عالم ناصر الدین البانی تحریر فرماتے ہیں:

الذی أراه: ان الصلاةَ حاسرَ الراسِ مكروهةٌ، ذلك انه من المسلَّم به: استحبابُ دخول المسلم فی الصلاة فی أكملِ هيئةٍ إسلاميّةٍ للحديث: فإن اللّٰه احق ان يُتَزَيَّن له. الخ

وليس من الهيئة الحسنة فی عرف السّلف، اعتياد حسر الراس، والسيّر كذلك فی الطرقات والدخول كذلك فی أماكن العبادات، بل هذه عادة أجنبيّة، تسرّبت إلى كثير من البلاد الإسلاميّة، حينما دخلها الكفار، وجلبوا إليها عاداتهم الفاسدة، فقلّدهم المسلمون فيها، فأضاعوا بها وبأمثالها من التقاليد شخصيتهم الإسلاميّة، فهذا العرض الطارى لا يصلح أن يكونَ مسوغاً لمخالفةِ العُرفِ الإسلامی السابق. (تمام المنة فی التعليق على فقه السنة ١/١٦٤)

میں سمجھتا ہوں کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے؛ اس لیے کہ نماز کا مکمل اسلامی ہیئت میں ادا کرنا مستحب ہے، یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ اس بات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ اس کے لیے تم اپنے آپ کو سنوارو، نیز ننگے سر رہنے کی عادت بنالینا، بازاروں میں ننگے سر گھومنا، عبادت کی جگہوں میں ننگے سر داخل ہونا، سلفِ صالحین کے طریقے کے خلاف اور غیر اسلامی تہذیب کا اثر ہے، جو غیر مسلموں کی بری وفاسد تہذیب مسلمانوں میں در آئی ہے، مسلمانوں نے ان بری عادتوں کو قبول لیا ہے، اپنی اسلامی تہذیب اور پہچان کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

فتاوی علماء اہلِ حدیث میں مولانا غزنوی کی رائے اس طرح منقول ہے:

اگر ننگے سر نماز فیشن کی وجہ سے ہے، تو نماز مکروہ ہے، اگر خشوع کے لیے ہے، تو تشبہ بالنصاری ہے، اسلام میں سوائے احرام کے ننگے سر رہنا پسندیدہ نہیں ہے، اگر سستی کی وجہ سے ہے، تو منافقین کی عادت ہے، غرض ہر لحاظ سے ناپسندیدہ ہے۔ (فتاوی علمائے حدیث بحوالہ کتاب الفتاوی ۲/۲۲۴)

معروف عالم دین مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ فرماتے ہیں:

صحیح مسنون طریقہ نماز کا وہی ہے، جو آں حضور ﷺ سے بالدوام ثابت ہوا ہے، یعنی بدن پر کپڑے اور سر ڈھکا ہوا ہو، پگڑی سے یا ٹوپی سے۔ (فتاوی ثنائیہ بحوالہ کتاب الفتاوی ۲/۲۲۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کے عمائم سے متعلق روایات

(۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ يَوْمَ

فَتْحِ مَكَّةَ - وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ بِغَيْرِ إِحْرَامٍ. (رواه مسلم عن جابر،كتاب الحج، باب جواز دخول مكة بغيراحرام:١٣٥٨)

(٢) عن عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ، عَنْ اَبِيهِ، قَالَ: كَاَنِّي اَنْظُرُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ، وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ، قَدْ اَرْخَى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ. (رواه مسلم عن جابر، كتاب الحج، باب جواز دخول مكة بغيراحرام:١٣٥٩)

(٣) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ رَاَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّاُ، وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ قِطْرِيَّةٌ، فَاَدْخَلَ يَدَهُ مِنْ تَحْتِ الْعِمَامَةِ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَاْسِهِ وَلَمْ يَنْقُضِ الْعِمَامَةَ. (رواه أبوداود، كتاب الطهارة، باب المسح على العمامة:١٤٧)

(٤) عَنْ اَبِى سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا اسْتَجَدَّ ثَوْبًا سَمَّاهُ بِاسْمِهِ إِمَّا قَمِيصًا، اَوْ عِمَامَةً ثُمَّ يَقُولُ: اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ كَسَوْتَنِيهِ اَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِهِ وَخَيْرِ مَا صُنِعَ لَهُ، وَاَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ، وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهُ. (رواه ابوداود، كتاب الطهارة، كتاب اللباس:٤٠٢٠، والترمذى، كتاب اللباس، باب ماجاء مايقول اذااستجد ثوبا:١٧٦٧)

كَانَتْ لَهُ عِمَامَةٌ تُسَمَّى: السَّحَابَ كَسَاهَا عَلِيًّا، وَكَانَ يَلْبَسُهَا وَيَلْبَسُ تَحْتَهَا الْقَلَنْسُوَةَ. وَكَانَ يَلْبَسُ الْقَلَنْسُوَةَ بِغَيْرِ عِمَامَةٍ، وَيَلْبَسُ الْعِمَامَةَ بِغَيْرِ قَلَنْسُوَةٍ. (زادالمعاد، فصل فى ملابسه صلى الله عليه وسلم)

(٥) عَنْ سَعْدٍ قَالَ: رَاَيْتُ رَجُلًا بِبُخَارَى عَلَى بَغْلَةٍ بَيْضَاءَ عَلَيْهِ عِمَامَةُ خَزٍّ سَوْدَاءُ، فَقَالَ: كَسَانِيهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواه ابوداود، كتاب الطهارة، كتاب اللباس، باب ماجاء فى الخز:٤٠٣٨ والترمذى، كتاب التفسير، سورة الحاقه:٣٣٢١)

(٦) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَعْرَابِ لَقِيَهُ بِطَرِيقِ مَكَّةَ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ، وَحَمَلَهُ عَلَى حِمَارٍ كَانَ يَرْكَبُهُ. وَاَعْطَاهُ عِمَامَةً، كَانَتْ عَلَى رَاْسِهِ. (رواه مسلم عن جابر،كتاب البروالصلة، باب صلة اصدقاء الاب:٢٥٥٢)

(٧) عَنْ اَبِى جَعْفَرٍ الْاَنْصَارِيِّ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى عَلِيٍّ عِمَامَةً سَوْدَاءَ يَوْمَ قُتِلَ عُثْمَانُ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٥١)

(٨) حَدَّثَنَا اَبُو الْعَنْبَسِ عَمْرُو بْنُ مَرْوَانَ، عَنْ اَبِيهِ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى عَلِيٍّ عِمَامَةً

سَوْدَاءَ قَدْ اَرْخَى طَرَفَهَا مِنْ خَلْفِهِ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٥٣)

(٩) حَدَّثَنَا سَلَمَةُ بْنُ وَرْدَانَ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى اَنَسٍ عِمَامَةً سَوْدَاءَ عَلَى غَيْرِ قَلَنْسُوَةٍ، وَقَدْ اَرْخَاهَا مِنْ خَلْفِهِ نَحْوًا مِنْ ذِرَاعٍ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٥٥)

(١٠) عَنْ مِلْحَانَ بْنِ ثَرْوَانَ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى عَمَّارٍ عِمَامَةً سَوْدَاءَ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٥٧)

(١١) عَنْ اَبِى صَخْرَةَ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ عِمَامَةً سَوْدَاءَ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٦٠)

(١٢) عَنْ اَبِى عِيسَى، عَنْ اَبِيهِ زِيَادٍ، قَالَ: قَدِمَ شَيْخٌ يُقَالُ لَهُ سَالِمٌ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى اَبِى الدَّرْدَاءِ عِمَامَةً سَوْدَاءَ.(مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٦٣)

(١٣) حَدَّثَنَا حَزَنٌ الْخَثْعَمِيُّ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى الْبَرَاءِ عِمَامَةً سَوْدَاءَ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٦٦)

(١٤) عَنْ عَطَاءٍ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ عِمَامَةً سَوْدَاءَ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٦٧)

(١٥) عَنْ حُسَيْنِ بْنِ يُونُسَ، قَالَ: رَاَيْتُ عَلَى وَاثِلَةَ عِمَامَةً سَوْدَاءَ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٦٩)

(١٦) عَنْ اَبِى رَزِينٍ، قَالَ: خَطَبَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:٢٤٩٧٠)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کی ٹوپیوں سے متعلق روایات

(١) قَالَ رُكَانَةُ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: فَرْقُ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِينَ، الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ. (رواه ابوداود، كتاب اللباس، باب العمائم:٤٠٣٨) والترمذى، كتاب اللباس، باب العمائم على القلانس:١٧٨٤ وقال هذاحديث غريب)

(٢) عن ابن عمر قال: كان رسول اللّٰه -ﷺ- يلبس قلنسوة بيضاء. رواه الطبرانى، وفيه عبد اللّٰه بن خراش، وثقه ابن حبان وقال: ربما اخطا، وضعفه جمهور

الائمة، وبقية رجاله ثقات. (مجمع الزوائد، كتاب اللباس، باب فی القلسنوة:۸۵۰۵)

(۳) عن ابن عمر قال: كان رسول اللّٰه – صلى اللّٰه عليه وسلم – يلبس كمة بيضاء. رواه الطبرانی فی الاوسط عن شيخه محمد بن حنيفة الواسطی وهو ضعيف ليس بالقوی. (مجمع الزوائد، كتاب اللباس، باب فی القلسنوة:۸۵۰۶)

(۴) قَالَ الحَسَنُ: كَانَ القَوْمُ يَسْجُدُونَ عَلَى العِمَامَةِ وَالقَلَنْسُوَةِ وَيَدَاهُ فِي كُمِّهِ. (رواه البخاری، كتاب الصلوة، باب السجود على الثوب، تعليقا)

(۵) عن جعفر بن عبد اللّٰه بن الحكم: ان خالد بن الوليد فقد قلنسوة له يوم اليرموك، فقال: اطلبوها، فلم يجدوها، فقال: اطلبوها، فوجدوها فإذا هی قلنسوةٌ خَلِقَةٌ، فقال خالد: اعتمر رسول اللّٰه – صلى اللّٰه عليه وسلم – فحلق راسَه، فابتدرَ الناس جوانب شعره، فسبقتهم إلى ناصيته، فجعلتها فی هذه القلنسوة، فلم اشهد قتالا، وهی معی إلا رزقت النصرة. رواه الطبرانی، وابو يعلى بنحوه، ورجالهما رجال الصحيح، وجعفر سمع من جماعة من الصحابة فلا ادری سمع من خالد ام لا. (مجمع الزوائد، كتاب المناقب، باب ماجاء فی خالد بن الوليد:۱۵۸۸۲) **سنن سعید بن منصور میں روایت ہے، شامل کیا جائے۔**

(۶) قال ابن المنذر: لا نعلم احدا قال بالمسح على القلنسوة إلا انسا مسح على قلنسوته. (عمدة القاری، كتاب الوضوء، اذا ادخل رجليه الخ)

(۷) عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، قَالَ: رَأَيْتُ عَلَى ابْنِ الزُّبَيْرِ قَلَنْسُوَةً لَهَا رِقٌّ يَعْنِي بُرْطُلَةً. (مصنف ابن شيبة، كتاب اللباس والزينة، العمائم السود:۲۴۹۹۱)

ان تمام روایات وآثار سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابۂ کرام، تابعین عظام اور سلفِ صالحین سر پر ٹوپی بھی پہنتے تھے اور اس کے اوپر عمامہ بھی باندھا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث وآثار، جن میں بعض صحیح اور بعض ان کی موید ہیں، یہ بتلا رہی ہیں کہ سر کو ڈھانکنا یعنی ٹوپی یا عمامہ سے آراستہ رکھنا، بالخصوص نماز کے موقع پر ننگے سر ہونے سے بچنا اسلامی تہذیب کا حصہ اور مسنون لباس میں شامل ہے، ننگے سر رہنے کی ترغیب وفضیلت کا کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ صحیح حدیثوں میں، نہ ہی ضعیف روایتوں میں، معلوم ہوا کہ موجودہ زمانے کا یہ فیشن اور مغربی تہذیب کا اثر ہے جس سے احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

رسم ورواج کا شرعی حکم

از: مفتی عبید الرحمٰن، مردان
رئیس دارالافتاء والارشاد مردان

کسی کام کو کرنے کا جو طریقہ وڈھنگ رائج ہو، اس کو رسم کہا جاتا ہے۔ رسم کے متعلق نکتہ اعتدال پر بہت کم لوگ گامزن ہوتے ہیں، کچھ لوگ تو ہر قسم کے رسم ورواج کی مذمت وممانعت کرتے ہیں جب کہ کچھ لوگ اس میں اس حد تک تساہل سے کام لیتے ہیں کہ اتفاقی طور پر ممنوع رسوم کو بھی اختیار کرنے یا کم از کم اس کی مذمت کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ جب کہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ رسم ورواج کسی بھی معاشرے میں ضروری جز کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے کوئی معاشرہ خالی نہیں ہوسکتا؛ اس لیے اس طرح متضاد رویّوں اور غیر محتاط فیصلوں کی وجہ سے معاشرے میں بے راہ روی جنم لیتی ہے۔ یہاں اصلاحِ احوال کے پیش نظر چند سطور سپردِ قلم کیے جاتے ہیں۔

رسم جاری اور رائج ہونے کی وجوہات

حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں رسوم سے متعلق ایک باب قائم فرمایا ہے، اس میں رسم جاری ہونے اور پھر بڑھنے اور پھیلنے کی وجوہات کی طرف بھی اختصار کے ساتھ تعرّض فرمایا ہے، اس کی روشنی میں رسم جاری ہونے کی وجہ کسی بڑے شخص کا استنباط کرنا ہے، چاہے وہ کوئی عقل مند شخص ہو جو اپنی ذہانت وتجربے سے کوئی نیا طریقہ جاری کرے یا کوئی باخدا آدمی ہو اور الہام کے ذریعے کوئی نئی راہ دریافت کرلے۔

اس کے بعد جب رسم پیدا ہوجاتی ہے اور ایجاد کرنے والا یا اس کو اختیار کرنے والا شخص مقتدیٰ ہو، لوگ اس کی اقتداء کرتے ہوں تو اس کی وجہ سے ایسی رسم لوگوں میں پھیل جاتی ہے۔ پھر اگر اس رسم کی خلاف ورزی پر (اتفاقیہ طور پر) کسی کا کوئی نقصان ہوجائے یا پابندی کرنے پر کسی کا کچھ بھلا ہوجائے تو اس کے بعد وہ رسم لوگوں میں خوب جڑ پکڑ لیتی ہے اور لوگ بہر حال اس کی پابندی کرنے

لگ جاتے ہیں۔(۱)

رسم کا فقہی حکم

رسم کا تعلق اگر عبادات کے علاوہ معاملات کے ساتھ ہو تو دیگر تمام معاملات کی طرح اس میں بھی اصل اباحت ہی ہے؛ لہٰذا جب تک اس کی ممانعت کی کوئی واقعی شرعی بنیاد متحقق نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کو مباح ہی سمجھا جائے گا۔

رسم کے ناجائز ہونے کی تین وجوہات

رسم سے متعلق ممانعت کی عام طور پر درج ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- معصیت پر مشتمل ہونا۔ اگر کوئی رسم ایسی ہے جو کسی ایسے عنصر پر مشتمل ہے جو شریعت کی نظر میں ممنوع و ناجائز ہے تو ایسی رسم کو رواج دینا، اس پر عمل کرنا بھی ناجائز ہے؛ چنانچہ شادی بیاہ کے بہت سی رسوم ایسی ہیں جو مختلف قسم کے معاصی و منکرات پر مشتمل ہوتی ہیں، اسی بنا پر ان کو ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔

۲- ابتداع کا ہونا۔ کوئی رسم ایسی ہو جو بذاتِ خود تو کسی معصیت پر مشتمل نہ ہو؛ لیکن اس کے ساتھ کوئی ایسا عنصر مل جائے جس کی وجہ سے وہ بدعت کے زمرے میں داخل ہو جائے، عبادات اور صدقات وغیرہ کے متعلق اکثر رسوم کا یہی حال ہے، فوتگی کے موقع پر انجام دئے جانے والے اکثر رسوم کا نیکی ہونے کے طور پر لوگ ارتکاب کرتے ہیں، بعض اوقات اعتقاد ایسا رکھتے ہیں اور بعض اوقات عملی طور پر ایسے کچھ عناصر پائے جاتے ہیں۔

۳- سدِّ ذرائع۔ اگر کوئی رسم ایسی ہو جس میں درج بالا دو خامیاں موجود نہ ہوں تو اس کے ناجائز ہونے کی مزید وجہ ''سدِّ ذرائع'' ہی ہوسکتی ہے۔ اس کی پھر درج ذیل مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف: کوئی رسم ایسی ہو جس میں فی الحال تو کوئی معصیت نہ ہو؛ لیکن مآل کار اس کی وجہ سے کسی دینی واجب پر عمل فوت ہو جانے یا کسی گناہ کا ارتکاب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو، مثال کے طور پر کوئی جائز کام ہے؛ لیکن خطرہ ہے کہ اگر اس کو رسم کی حیثیت حاصل ہو جائے تو لوگ اس کی ناجائز حد تک پابندی کرنا شروع کریں گے اور اس کے مقابلے میں اگر کوئی دینی واجب حکم بھی آجائے تو بھی اس کو چھوڑیں گے، یا اس کی وجہ سے گناہوں کا ارتکاب کریں گے۔

مثال کے طور پر فوتگی ہو جانے کے بعد، جمعرات، ہفتہ وار اور چالیسویں دن پابندی کے ساتھ چاول پکانے اور کھلانے کا جو رواج ہے، اس میں پہلے پہل کوئی خرابی نہ تھی، بعد میں جب اس نے رسم

کی حیثیت اختیار کی تو متعدد خامیاں ضم ہونا شروع ہوگئیں، اب رسم پڑ جانے کے بعد تو ان امور کا حکم واضح ہے، اس سے پہلے کا حکم یہ ہے کہ اس کو رسم کی حیثیت تک پہنچانا کسی طرح درست نہ تھا، جن افراد کو اس کے نتائج کا علم تھا، ان کے لیے شروع سے ہی اس سے احتراز کرنا ضروری تھا۔

ب: اسی ''سدّ ذرائع'' کے ضمن میں یہ صورت بھی داخل ہوجاتی ہے کہ بعض اوقات کوئی کام اپنی ذاتی حیثیت سے بالکل مباح ہوتا ہے؛ لیکن رسم بننے اور رائج ہوجانے کے بعد وہ بہت سے افراد کے لیے گرانی ومشقت کا ذریعہ بن جاتا ہے؛ کیونکہ اس رسم کی ادائیگی کی طاقت نہیں ہوتی اور اس کے بغیر ناک کٹنے کے ڈر سے بعض ضروری کام بھی چھوڑے جاتے ہیں یا غلط کام کا بھی ارتکاب کرلیا جاتا ہے، ایمانی حالت اس قابل نہیں ہوتی کہ لوگوں کے طعنوں سے بالاتر ہوکر قدم اٹھائے۔

ج: دینی طبقہ کے التزام وپابندی کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عام لوگ اس کام کو سنت ومستحب اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ اہمیت کا درجہ دیدیتے ہیں، اس سے بھی بچنے کا اہتمام کرلینا چاہیے، ''تنقیح الفتاوی'' میں ہے:

''کلُ مباحٍ یؤدی إلی زَعْمِ الجُهَّالِ سنیةَ أمرٍ أو وُجوبِهٖ فهو مکروهٌ''.(۲)

ترجمہ: ''جو مباح کام بھی جہلاء کے لیے (اپنی واقعی حیثیت سے بڑھ کر) اس کام کے سنت یا واجب سمجھنے کا ذریعہ بنتا ہے وہ (مباح، مباح نہیں رہتا بلکہ) مکروہ بن جاتا ہے''۔

د: اسی کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ رسم کی پابندی کرنے کی وجہ سے شرعی واجبات کی ادائیگی میں تاخیر کا اندیشہ ہوجائے، علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے رسوم کی پابندی مکروہ ہونے کی وجوہات میں سے ایک اس کو بھی ذکر فرمایا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

إِذَا ثَبَتَ هَذَا، فَالدُّخُولُ فِي عَمَلٍ عَلَى نِيَّةِ الِالْتِزَامِ لَهُ إِنْ كَانَ فِي الْمُعْتَادِ، بِحَيْثُ إِذَا دَاوَمَ عَلَيْهِ؛ أَوْرَثَ مَلَلًا، يَنْبَغِي أَنْ يُعْتَقَدَ أَنَّ هَذَا الِالْتِزَامَ مَكْرُوهٌ ابْتِدَاءً، إِذْ هُوَ مُؤَدٍّ إِلَى أُمُورٍ جَمِيعُهَا مَنْهِيٌّ عَنْهُ:

أَحَدُهَا:... وَالثَّانِي: خَوْفُ التَّقْصِيرِ أَوِ الْعَجْزِ عَنِ الْقِيَامِ بِمَا هُوَ أَوْلَى وَآكَدُ فِي الشَّرْعِ. "وَقَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِخْبَارًا عَنْ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: إِنَّهُ كَانَ يَصُومُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا"، وَلَا يَفِرُّ إِذَا لَاقَى؛ تَنْبِيهًا عَلَى أَنَّهُ لَمْ يُضْعِفْهُ الصِّيَامُ عَنْ لِقَاءِ لِعَدُوٍّ فَيَفِرُّ وَيَتْرُكُ الْجِهَادَ فِي مَوَاطِنَ تُكَبِّدُهُ بِسَبَبِ ضَعْفِهِ. وَقِيلَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: إِنَّكَ لَتُقِلُّ الصَّوْمَ، فَقَالَ: "إِنَّهُ يَشْغَلُنِي عَنْ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ، وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ".

وَلِذَلِكَ كَرِهَ مَالِكٌ إِحْيَاءَ اللَّيْلِ كُلِّهِ، وَقَالَ: "لَعَلَّهُ يُصْبِحُ مَغْلُوبًا، وَفِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ"، ثُمَّ قَالَ: "لَا بَأْسَ بِهِ؛ مَا لَمْ يَضُرَّ بِصَلَاةِ الصُّبْحِ". وَقَدْ جَاءَ فِي: صِيَامِ يَوْمِ عَرَفَةَ أَنَّهُ يُكَفِّرُ سَنَتَيْنِ، ثُمَّ إِنَّ الإِفْطَارَ فِيهِ لِلْحَاجِّ أَفْضَلُ؛ لِأَنَّهُ قُوَّةٌ عَلَى الْوُقُوفِ وَالدُّعَاءِ، وَلِابْنِ وَهْبٍ فِي ذَلِكَ حِكَايَةٌ. وَقَدْ جَاءَ فِي الْحَدِيثِ: "إِنَّ لِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِزُوَّارِكَ عَلَيْكَ حَقًّا"، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَإِذَا انْقَطَعَ إِلَى عِبَادَةٍ لَا تَلْزَمُهُ فِي الْأَصْلِ؛ فَرُبَّمَا أَخَلَّ بِشَيْءٍ مِنْ هَذِهِ الْحُقُوقِ.(۳)

ترجمہ: ''کسی غیر ضروری (عبادت) کام اپنے اوپر مقرر کرنا، اگر عام طور پر اسے ہمیشہ سرانجام دینے سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہو تو مناسب یہ ہے کہ اس التزام کو ابتداء ہی سے مکروہ سمجھے؛ کیونکہ یہ عمل کئی منکرات کا ذریعہ بنتا ہے، اس کی وجہ سے اس سے زیادہ اہمیت کے حامل کاموں میں کوتاہی یا اسے ادا کرنے سے بندہ عاجز ہوتا ہے؛ حالانکہ آپ ﷺ نے (اعتدال کی تلقین فرمائی ہے اور) حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ''وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار اور جب دشمن کا سامنا کرتے تو اس وقت منہ نہ موڑ لیتے''۔ اس میں اس بات کی طرف تنبیہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ان کے جہاد میں رکاوٹ نہ بنتا کہ وہ منہ موڑ کر چلے جاتے اور سخت مواقع میں جہاد چھوڑ کر (روزہ کی) ضعف کی وجہ سے تکلیف کا سامنا کرتے۔ کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ: آپ بہت کم روزے رکھتے ہیں (کیوں؟) انھوں نے فرمایا کہ: روزہ کی وجہ سے مجھ سے قرآن کریم کی تلاوت رہ جاتی ہے جب کہ قرآن کی تلاوت مجھے روزے سے زیادہ محبوب ہے''۔ اس وجہ سے امام مالک ساری رات عبادت کو مکروہ سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ: شاید صبح کے وقت اس پر نیند کا غلبہ ہو جائے (اور صبح کی نماز اور جماعت جو زیادہ اہمیت کے حامل ہیں وہ رہ جائیں) حالانکہ ہمارے لیے آپ ﷺ کا (اعتدال والا بہترین) نمونہ کافی ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ: اگر صبح کی نماز فوت ہونے کا خوف نہ ہو تو ساری رات عبادت کرنے میں حرج نہیں۔ عرفہ کے روزے کے بارے میں روایات میں وارد ہے کہ: وہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ ہے؛ حالانکہ حجاج کے لیے اسی دن افطار بہتر ہے؛ کیونکہ افطار کی وجہ سے وقوف اور دعا میں مدد اور قوت ملتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''تمہارے اہل وعیال، نفس اور ملاقاتیوں کا آپ کے اوپر حق ہے''۔ لہٰذا جو کوئی نفلی عبادت میں مشغول ہو کر کنارہ کشی اختیار کرے تو بسا اوقات وہ اس کی وجہ سے ان واجب حقوق میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے''۔

ایک اشکال وجواب

اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ ایسا تو اکثر رسوم میں ہوتا ہے؛ بلکہ شاید دنیا کے ہر رسم کا یہ حال ہے کہ دینی لحاظ سے کمزور لوگوں کے لیے وہ مختلف منکرات کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس تناظر میں تو کسی بھی رسم کی گنجائش نہ رہے گی اور سب رسوم ناجائز قرار پائیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی بھی رسم پر عام حکم مرتب کرنے میں معاشرے کے عام افراد اور عام صورتِ حال کا لحاظ رکھا جاتا ہے، چند افراد کے تجاوز کرنے یا چند خاص واقعات اور صورتوں میں خلافِ شرع امور کے ارتکاب کیے جانے کی وجہ سے عام حکم مرتب کرنا قرینِ قیاس نہیں ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس باب میں معاشرے اور لوگوں کی صورت حال کو بھی دیکھا جاتا ہے، ان عناصر کی بنیاد پر حکم میں اختلاف وتفاوت بھی ہوسکتا ہے؛ چنانچہ اگر کوئی معاشرہ ایسا ہے جہاں دینی نفسیات کا غلبہ ہو، لوگ شرعی حکم وتقاضے کو عموماً نفسیاتی باتوں یا رسمی طریقوں پر ترجیح دیتے ہوں تو ایسے معاشرے میں کسی رسم کو رواج دینے کا حکم الگ ہوگا اور جہاں اس کے خلاف فضا ہو، وہاں الگ۔

دورِ سلف اور دورِ حاضر کے فرق کی بنیاد

اس سے وہ اشکال بھی دور ہوجاتا ہے جو بہت سے افراد کے لیے تردّد کا باعث بن جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسم تو ہر معاشرے کا ضروری حصہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر اس طرح ہر رسم کی مذمت ومخالفت برحق ہے تو دورِ سلف کے رسم ورواج کی کیا توجیہ ہوگی؟ وہاں بھی تو طرح طرح کے رسوم رائج تھے؛ لیکن سلف کے یہاں عام رواجوں پر نکیر کرنا منقول نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصولی طور پر رسم کی مذمت وممانعت کرنے کی شرعی بنیاد پر غور کرلینا چاہیے اور ادوار کے بجائے اسی پر حکم کا مدار رکھ لینا چاہیے، ممانعت کی بنیادیں اوپر ذکر کی جاچکی ہیں، ان پر غور کیا جائے تو دورِ سلف میں ان کا وجود کم تھا اور آج کل زیادہ؛ چنانچہ اس دور میں عام طور پر دینی حکم کی قدردانی تھی؛ اس لیے رسوم عام طور پر دینی منکرات کے ارتکاب کرنے کا باعث نہ بنتی تھیں؛ جب کہ آج کل کی صورتِ حال مختلف اور بہت مختلف ہے، یہاں دینی حکم کی بہ نسبت رسم ورواج کو ترجیح دی جاتی ہے؛ اس لیے دونوں ادوار کا عمومی حکم بھی مختلف ہوا۔

ہمارے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر متعدد رسوم کا رواج؛ بلکہ راج ہے، معاشرے کی اکثر آبادی ابھی تک اس کی پوری پابندی کرتی آئی ہے، ایک، دو نہیں؛ بلکہ سیکڑوں، ہزاروں واقعات

ایسے ہیں جہاں کسی لڑکے، لڑکی کے لیے شادی کرنا شرعی واخلاقی نقطۂ نظر سے ضروری ہوتا ہے؛ لیکن رائج رسوم کے انتظام نہ کرسکنے کی وجہ سے شادی کو خواہ مخواہ مؤخر کیا جاتا ہے خواہ اس میں دسیوں گناہوں کا ارتکاب ہی کیوں نہ ہوجائے، یوں ہی شادی کے موقع پر جب ان رسوم کی ادائیگی کی جاتی ہے تو وہاں دسیوں شرعی احکام کو پامال کیا جاتا ہے؛ لیکن بہرحال ان رسوم کی ادائیگی کرلی جاتی ہے۔

کچھ غلط بنیادیں

رسم کے ساتھ ربط وتعامل میں جو غلطیاں کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک غلطی یہ بھی ہے کہ بسا اوقات بعض رائج رسموں کو ایسی وجوہات کی بنیاد پر ممنوع قرار دیا جاتا ہے جو فقہی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہوتیں، چنانچہ:

۱- بعض لوگ اس بنیاد پر کسی رسم کو ناجائز اور ممنوع ٹھہراتے ہیں کہ: ''یہ حضرات صحابۂ کرام، یا دورِ سلف میں موجود نہ تھا؛ اس لیے ممنوع ہے''؛ حالانکہ دورِ سلف میں موجود نہ ہونے کو کسی چیز کے ناجائز ہونے کی بنیاد ٹھہرانا بالکل ناکافی ہے، خاص کر دنیوی رسوم کے لیے تو اس بات کو بنیاد بنانا بالکل ہی بیجا ہے؛ کیونکہ عبادات کے علاوہ امور میں اکثر اہلِ علم کے نزدیک اصل اباحت ہے۔

۲- بعض اوقات نئے رسم ورواج کو ''بدعت'' قرار دیا جاتا ہے؛ حالانکہ اس میں بدعت ہونے کی اساس موجود نہیں ہوتی؛ چنانچہ تسبیح کے دانوں کے ساتھ ذکر کرنے کو اسی بنیاد پر بدعت قرار دیا جاتا ہے؛ حالانکہ شرعی نقطۂ نظر سے کسی چیز کے بدعت ہونے کے لیے جو باتیں ضروری ہیں، وہ اس میں موجود نہیں۔

۳- کفار کے ساتھ تشبّہ کی بنیاد پر بھی بسا اوقات کچھ رسموں کو ناجائز قرار دیا جاتا ہے، یہ بنیاد فی نفسہٖ بالکل درست ہے اور حقیقتِ حال یہی ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں کفار کی بہت سی رسمیں اختیار کی جاتی ہیں جو کہ اصلاً ناجائز اور مذموم ہے، تاہم حضرات فقہائے کرام نے کفار کے ساتھ مشابہت کے ناجائز ہونے کے لیے جو ضوابط ذکر فرمائے ہیں، ان کا خیال رکھنا ضروری ہے، انھیں کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اس بنیاد پر کسی رسم وغیرہ کو ناجائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ان ضوابط کا خیال رکھے بغیر ناجائز ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے؛ چنانچہ بسا اوقات کوئی چیز کافروں اور مسلمانوں، دونوں کے یہاں دیکھ کر اس کو کفار کے ساتھ تشبہ سمجھ کر ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔[۴]

۴- بعض لوگوں کے عملی برتاؤ سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ خود رسم ہونے کو ہی وہ ناجائز ہونے کی وجہ سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض لوگوں کی باتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ گویا رسم ہونا ناجائز یا گناہ ہونے

کے مترادف ہے، یہ بھی غلط ہے، کسی چیز کا رسم ہونا جس طرح جائز ہونے کی دلیل نہیں ہے، یوں ہی ناجائز ہونے کی بھی بنیاد نہیں ہے، جواز یا عدم جواز کے لیے بہر حال شرعی دلائل کی طرف مراجعت کرنا اور انھیں کا سہارا لینا ضروری ہے، شرعی دلیل کے بغیر کسی چیز کو جائز یا ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

علامہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ بلّی کے جھوٹے کے حکم کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

والكراهةُ حكمٌ شرعيٌ يحتاجُ خصوصُهٗ إلى دليلٍ، وشدةُ المخالَطَةِ دليلُ الطهارة فقط فَتَبْقٰى الكراهةُ بلا دليلٍ.(۵)

ترجمہ: ''مکروہ ہونا ایک شرعی حکم ہے جس کے لیے کوئی دلیل درکار ہے، بلی کا لوگوں کے ساتھ زیادہ اختلاط پاکی کی دلیل ہے (تو جب پاکی کی دلیل موجود ہے تو اس کے باوجود اس کے جھوٹا پانی مکروہ سمجھنا درست نہیں؛ کیونکہ) کراہت کی کوئی دلیل نہیں''۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ ایک دوسرے مسئلہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

وَلَا يَلْزَمُ مِنْ تَرْكِ المستحبِ ثبوتُ الكراهةِ إذ لا بُدَّ لَها مِنْ دليلٍ خاصٍ فلذا كان المختارُ عَدَمُ كراهةِ الأكلِ قَبْلَ الصلاة.(۶)

ترجمہ: ''مستحب چھوڑنے سے کراہت لازم نہیں آتی؛ کیونکہ کراہت کے لیے خاص دلیل درکار ہے؛ لہٰذا نماز عید سے پہلے کھانا کھانا بلا کراہت درست ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ، نے علامہ عبد الغنی نابلسی رحمہ اللہ سے اس سلسلہ میں ایک بڑی مفید عبارت نقل فرمائی ہے جو اصلاً تو تمباکو کی شرعی حیثیت سے متعلق ہے؛ لیکن اس سے متعدد پہلوؤں میں استفادہ کیا جاسکتا ہے، علامہ موصوف رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں:

قلت: وألَّفَ فی حله أيضا سيدنا العارف عبد الغنی النابلسی رسالةً سماها (الصلحُ بينَ الإخوانِ فِي إباحةِ شُرْبِ الدُّخان) وتعرض له فی كثير من تآليفه الحسان، وأقام الطامة الكبرى على القائل بالحرمة أو بالكراهة فإنهما حكمان شرعيان لا بد لهما من دليل ولا دليل على ذلك.. وليس الاحتياط فی الافتراء على اللّٰه تعالى بإثبات الحرمة أو الكراهة اللذين لا بد لهما من دليل بل فی القول بالإباحة التی هی الأصل، وقد توقف النبی -صلى اللّٰه عليه وسلم- مع أنه هو المشرع فی تحريم الخمر أم الخبائث حتى نزل عليه النص القطعی، فالذی ينبغی للإنسان إذا سئل عنه سواء كان ممن يَتَعَاطَاهُ أَوْ لَا كهذا العبدِ الضعيفِ وجميعِ مَنْ فی بيته أن يقولَ هو مباحٌ، لكن

رَائِحَتُهُ تَسْتَكْرَهُهَا الطِّبَاعُ؛ فهو مكروهٌ طبعًا لا شرعًا.(۷)

ترجمہ: ''علامہ عبدالغنی نابلسیؒ رحمہ اللہ نے تمباکو کے حلال ہونے کے بارے میں ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے اور اپنی کئی کتابوں میں اس سے متعلق بات کی ہے، انھوں نے تمباکو نوشی کو حرام یا مکروہ سمجھنے والوں کے خلاف کافی مضبوط دلائل پیش کیے ہیں؛ کیونکہ حرمت اور کراہت دونوں شرعی احکام ہیں اور دلائل کے محتاج ہیں؛ جب کہ یہاں حرمت وکراہت کی کوئی دلیل نہیں، اللہ تعالی پر جھوٹ باندھ کر کسی چیز کو اپنی طرف سے مکروہ اور حرام قرار دینے میں کون سی احتیاط ہے؟ حالانکہ حرمت اور کراہت کے لیے شرعاً دلائل درکار ہوتے ہیں، احتیاط یہی ہے کہ اسے مباح سمجھے؛ کیونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ خود حضور ﷺ نے شراب جیسے گناہوں کی جڑ کے بارے میں بھی نص کے نزول تک توقف فرمایا، یہاں تک قطعی حکم اس کے بارے میں نازل ہوا۔ لہٰذا جس سے بھی تمباکو کے بارے میں پوچھا جائے خواہ وہ اسے پیتا ہو یا نہیں، جیسا کہ بندہ عبدالغنی اور اس کے تمام گھر والے تو اسے چاہیے کہ اسے مباح قرار دے دے؛ البتہ چونکہ اس کی بو طبیعت کو ناگوار لگتی ہے، اس وجہ سے طبعی طور پر کراہت کا باعث ہے؛ مگر شرعاً مکروہ نہیں''۔

واللّٰہ تعالیٰ اعلم.

❋ ❋ ❋

حواشی

(۱) حجة اللّٰه البالغة، باب الرسوم السائرة فی الناس، ج۱ ص۱٤۸.

(۲) تنقيح الفتاوى الحامدية، مسائل وفوائد شتى من الحظر والإباحة وغير ذلك، ج۲ ص۳٤۷، مكتبه حقانيه.

(۳) الاعتصام للشاطبی ت الهلالی، فَصْلٌ الدُّخُولُ فِی عَمَلٍ عَلَى نِيَّةِ الِالْتِزَامِ لَهُ، ج۱ ص ۳۳٦.

(۴) تشبہ بالکفار کی حقیقت کیا ہے اور اس بارے میں شرعی احکامات کیا ہیں اس کے لیے: ''مسئلہ تشبہ بالکفار، اس کی تحقیق وتفصیل اور حدود وقیود'' نامی مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) فتح القدير للكمال ابن الهمام كتاب السير، باب الغنائم وقسمتها، ج۵ ص٤۸۱.

(٦) البحر الرائق شرح كنز الدقائق ومنحة الخالق وتكملة الطورى كتاب الصلاة، باب العيدين، ج۲ ص ۱۷٦.

(۷) الدر المختار وحاشية ابن عابدين، كتاب الأشربة، ج٦ ص ٤٥۹.

❋ ❋ ❋

حضرت مولانا محمد فاروق شہیدؒ
حیات وخدمات

از: مولانا محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی
استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

یکم ذی الحجہ ۱۴۴۵ ہجری، مطابق ۸/ جون بروز ہفتہ، صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہوں گے، راقم حروف اس وقت جلالین شریف پڑھا رہا تھا کہ اچانک برخوردار عزیزم مولوی محمد طٰہٰ شبلی سلّمہٗ اللہ تعالی (مقیم حال ممبئی) کا فون آیا۔ بندے نے درس کی وجہ سے ریسیو نہیں کیا، انھوں نے دوبارہ کال کی، تو خیال ہوا کہ کوئی ایمرجنسی بات ہوگی، ورنہ دوبارہ کال نہ کرتے۔ فون اٹھایا تو گھبرائی ہوئی آواز میں بتائے کہ پھوپھا جان (یعنی میرے حقیقی بہنوئی حضرت مولانا محمد فاروق رحمۃ اللہ علیہ) کو کسی نے شہید کردیا۔

خبر کیا تھی، گویا بجلی گر پڑی، ہوش وحواس اڑ گئے اور دل یہی کہہ رہا تھا کہ کاش خبر غلط ہو۔ سبق بند کر کے بھاگا ہوا گھر آیا اور خبر کی تصدیق کے لیے اعزاء واقرباء سے رابطہ کرنے لگا۔ اتنی دیر میں خبر بذریعہ موبائل جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور دل کو دہلا دینے والی خون آلود آپ کی نعش کی تصویر پورے ملک میں پہنچ چکی تھی؛ لیکن صحیح صورتحال کا علم ابھی کسی کو نہیں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہوا۔ علاقے کے جس مسلمان کو بھی معلوم ہوا وہ واقعے کی تحقیق کے لیے مولانا کے گاؤں سون پور کی طرف دوڑ پڑا۔

آناً فاناً علاقے کے ہزاروں مسلمان جائے حادثہ پر پہنچ گئے اور قاتلین کو فوری طور پر گرفتار کر کے مقدمہ درج کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ بھاری فورس بھی پہنچ گئی تھی، جس کی وجہ سے لاش کو جائے حادثہ سے اٹھانا مشکل ہو رہا تھا اور ایک خطرناک ہنگامی صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہیں یہ حادثہ کسی بڑے فساد کا سبب نہ بن جائے۔ موقع پر موجود اہل خانہ وعلماء نے بڑی مشکل سے حالات کو قابو کیا؛ اس لیے جس سے بھی رابطہ کیا یہی جواب دیا کہ ابھی حالات سخت کشیدہ ہیں اور بھیڑ بہت زیادہ ہے؛ اس لیے صحیح صورتحال کا علم نہیں ہو رہا ہے۔

واقعۂ شہادت

بندہ اسی وقت بذریعہ ٹرین دیوبند سے گھر کے لیے عازم سفر ہوا اور دوسرے دن شریک جنازہ رہا۔ گھر پہنچ کر واقعے کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ ایک برہمن سے آٹھ دس سال پہلے کسی زمین کا معاملہ ہوا تھا، بیع نامہ بھی ہوگیا تھا، چوں کہ وہ غریب تھا اور ضرورت پر آپ سے مدد بھی طلب کرتا رہتا تھا، اس لیے بیع نامہ کے باوجود آپ نے زمین پر قبضہ نہیں لیا اور کہہ دیا تم جوتتے بوتے رہو، جب ضرورت ہوگی لے لیں گے۔ اِدھر چند سال پہلے اس نے پھر ایک زمین کا معاملہ آپ سے کیا، جس کی پوری رقم بھی لے لی؛ لیکن جب بیع نامہ کی بات آئی، تو اس نے اس زمین کو کسی دوسرے آدمی سے بیچ دیا۔

اب آپ کو شبہ ہوا کہ یہ دھوکہ دینا چاہتا ہے؛ اس لیے آپ نے اصرار کیا کہ جس زمین کا بیع نامہ ہوگیا ہے، اس پر قبضہ دیدے اور دوسری زمین کے لیے جو رقم لے رکھی ہے اسے واپس کردے، وہ ٹال مٹول کررہا تھا کہ ۶؍جون کو اس نے آپ سے کہا کہ ایک دو دن میں آپ آجائیں اور پیمائش کے لیے فیتا بھی لیتے آئیں؛ تاکہ جس زمین کا بیع نامہ ہوا ہے اس کو آپ کے قبضہ میں دیدوں۔

۸؍جون صبح کوئی سات بج رہے ہوں گے کہ آپ تنہا اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا گھر آپ کے گاؤں کے قریب ہی تھوڑے فاصلے پر ہے۔ اس پورے گاؤں میں چھ سات ہی مکانات ہیں اور سب غیر مسلموں کے ہیں۔ بظاہر اخلاق سے ملا اور بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی، جب آپ بیٹھ گئے تو سامنے سے اسی کے گھر کے ایک فرد نے آپ کو باتوں میں مشغول کیا اور خود اس نے پیچھے سے آکر پھاوڑے یا کلہاڑی سے، اتنی قوت سے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا کہ آپ فوراً بے ہوش ہوکر گر گئے اور کرسی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد اس نے اور اس کی بیوی اور بیٹوں نے مل کر سر اور چہرے پر کلہاڑی سے کئی ایک وار کیے، سفید گھنی داڑھی سے گھرے ہوئے آپ کے انتہائی حسین وجمیل وپُرنور چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی اور اس وقت تک حملہ کرتے رہے؛ جب تک کہ انھیں یقین نہیں ہوگیا کہ آپ شہید ہوگئے۔

یہ واردات کوئی اچانک نہیں ہوئی؛ بلکہ طویل منصوبہ بندی اس کے لیے کی گئی تھی، علاقے میں آپ کے مضبوط سیاسی وسماجی اثر ورسوخ اور عوامی مقبولیت سے بہت سی اسلام دشمن طاقتیں خائف رہتی تھیں اور اسی وجہ سے وہ آپ کی جانی دشمن تھیں، دراصل ایسی ہی طاقتوں نے زمین کے معمولی تنازع کو مسئلہ بنا کر یہ واردات انجام دلوائی۔ یہی وجہ ہے کہ قاتل کی گرفتاری کے بعد بہت سی شدت پسند تنظیمیں کھل کر ان کی حمایت وپشت پناہی کرنے لگیں۔

اس بے رحمانہ وسفاکانہ واقعے نے ہم اہل خانہ ہی کو نہیں؛ بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو اور انسانی دل رکھنے والے ہر انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اس ظلم و بربریت کی دردناکی کو مسلمانوں اور سنجیدہ غیر مسلموں سب نے محسوس کیا اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شہادت کی خبر پھیلتے ہی موقع واردات پر ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور دوسرے دن نماز جنازہ میں ایک اندازے کے مطابق پچاس ساٹھ ہزار افراد نے شرکت کی۔

ملک کی اہم ملی تنظیموں اور دینی مراکز کے ذمہ داروں وسیاسی لیڈروں نے آپ کے گھر پہنچ کر اہل خانہ سے تعزیت کی۔ خصوصاً دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی، دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد راشد اعظمی، صدر جمعیۃ علمائے ہند حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا بلال حسنی ندوی، جمعیۃ علمائے ہند کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا حکیم الدین قاسمی، کانگرس کے قدآور لیڈر وممبر پارلیمنٹ عمران پرتاب گڑھی۔ ان کے علاوہ ضلع اور آس پاس کے اضلاع کی بہت سی سربرآوردہ شخصیتوں اور سیاسی لیڈروں نے اس واقعے کی مذمت کی اور گھر پہنچ کر اہل خانہ کی تعزیت کی۔

بہت سی تنظیموں نے اپنے پیغامات میں حکومت وقت سے قاتلوں کو سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا، پورے ملک کے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا نے اہمیت کے ساتھ آپ کی شہادت کی خبر کو، کئی دنوں شائع کیا۔ آس پاس کے غیر مسلموں نے اس دردناکی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے میڈیا کے سامنے کھل کر کہا کہ: ''مولانا تو ہم لوگوں کے لیے کسی بھگوان سے کم نہ تھے اور ضرورت پر ہمارے کام آتے تھے، کسی سے لڑنا جھگڑنا تو وہ جانتے ہی نہ تھے، پھر کیوں ان کو قتل کیا گیا، ہم سب خود حیرت زدہ اور غمگین ہیں''۔

چند سالوں سے آپ پر فکر آخرت کا غلبہ تھا، سفر وغیرہ سے بھی وحشت ہونے لگی تھی، اپنے بچوں سے فرماتے کہ: ''اب سارے کاموں کو تم لوگ سنبھالو اور مجھے فرصت دیدو، ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ بہت دن جی لیا، اب تو دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالی موت شہادت دیدیں۔ کبھی فرماتے دل چاہتا ہے مدینہ چلا جاؤں اور وہیں موت آجائے یا پھر مسجد اقصیٰ چلا جاؤں اور بقیہ زندگی وہیں گزاروں''۔ بلاشبہ آپ کی دعا قبول ہوئی اور تکوینی طور پر موت شہادت کا یہ انتظام کیا گیا۔

اوصاف حمیدہ

حقیقت یہ ہے کہ فاروق بھائی تھے ہی ایسے کہ ان پر رویا جائے، ان کی جدائی پر غم کیا جائے،

رب کریم نے انھیں جس طرح جسمانی طور پر انتہائی حسین جمیل بنایا تھا، سروقد عطا کیا تھا، ذاتی وجاہت سے نوازا تھا، اسی طرح اخلاق وکردار کی پاکیزگی سے بھی مزین کیا تھا۔ وہ سراپا محبت کا پیغام تھے، حسن اخلاق کا نمونہ تھے، اعلیٰ کردار کی مثال تھے، ان کی پوری زندگی جہد مسلسل، عمل پیہم اور حرکت وسرگرمی سے عبارت تھی، بھائی چارہ قائم کرانا، دوفریقوں میں صلح کرانا اور آپسی اختلافات کو ختم کرانا، ان کا مشن تھا۔ جس کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں؛ لیکن اپنے مشن کو نہیں چھوڑا۔ وہ گاؤں گاؤں اور بستی بستی جاکر محبت کا پیغام عام کرتے تھے اور حکمت وتدبر سے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرتے تھے، جس میں وہ کامیاب بھی تھے۔ انھوں نے پوری زندگی نہ تو کسی کو گالی دی اور نہ کسی سے لڑائی کی، وہ لڑنا جھگڑنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے بڑے سے بڑے مخالف سے بھی مسکرا کر ملتے، کوئی آدمی بُرا بھلا کہتا تو برداشت کرلیتے، لیکن پلٹ کر جواب نہ دیتے۔

حالانکہ طبیعت کے بڑے جری اور نڈر تھے، گویا اصلاً مزاج فاروقی تھا، خوف وڈر تو وہ جانتے ہی نہ تھے، رات بارہ ایک بجے بھی بلاتکلف تنہا موٹر سائیکل سے دور دور تک کا سفر کرنے میں انھیں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا، ان کے قریبی دوست مشہور شاعر وسیاسی لیڈر عمران پرتاپ گڑھی کے والد ڈاکٹر محمد الیاس صاحب نے بتایا کہ:

''ایک مرتبہ سرائے آنا دیو بازار کے چند غیر مسلموں نے ''مدرسہ تعلیم الدین سونپور'' کے کسی طالب علم کو تنہا پاکر مارا پیٹا، اس کی شکایت کرنے کے لیے شہر پرتاپ گڑھ کے ایس پی سے ملنے کے لیے ایک وفد تیار ہوا۔ شہر جانے کے لیے سیدھا راستہ ''سرائے آنا دیو بازار'' ہی سے ہوکر گزرتا ہے، اس لیے وفد کے اکثر ارکان کی رائے یہ ہوئی کہ دوسرے راستہ سے چلا جائے، اس راستے میں خطرہ ہے۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ چاہے جس راستے سے جائیں؛ لیکن میں اسی راستے سے جاوں گا؛ چنانچہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھے، ڈاکٹر محمد الیاس صاحب کہتے ہیں کہ آپ کی محبت میں، میں بھی آپ ہی کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھ گیا، جاتے ہوئے جب ''سرائے آنا دیو بازار'' آیا تو پان کی ایک دکان پر رُکے، جہاں کئی ایک غیر مسلم لڑکے کھڑے تھے، دوکاندار سے پان لگوایا؛ حالانکہ خود پان نہیں کھاتے تھے، پھر پان کی قیمت ادا کرنے کے لیے زائد رقم دی، دوکاندار جب زائد روپیہ واپس کرنے لگا تو کہا بقیہ پیسے اِن حرام خوروں کو دے دو۔ (یعنی دوکان کے پاس کھڑے غیر مسلم نوجوانوں کو، جنھوں نے طالب علم کو مارا تھا) یہ کہہ کر پھر آگے بڑھے''۔

جس زمانے میں مدرسہ تعلیم الدین سون پور پر قبضہ کرنے کے لیے گاؤں ہی کے کچھ لوگوں نے

ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے آپ کی جان تک کو خطرہ لاحق تھا، اس کے باوجود پابندی سے مدرسہ جاتے اور بعض مرتبہ وہیں مدرسے کے کھلے صحن میں رات بھی گزارتے۔ اس بات سے بے خوف ہوکر کہ دشمنوں کی نیت اچھی نہیں ہے، کہیں وہ کوئی واردات نہ کر بیٹھیں، کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ بعض مرتبہ چند شرارت پسند عناصر نے رات میں آپ پر حملہ کرنے کا ارادہ بھی کیا اور آپ کی چارپائی کے قریب بھی آگئے؛ لیکن حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ رب کریم نے آپ کی حفاظت فرمائی۔

اس کے بالمقابل دینی حمیت وغیرت کا حال یہ تھا کہ اسی ''مدرسہ تعلیم الدین سون پور'' کا اختلاف جب شدید سے شدید تر ہوگیا، یہ وہ دور ہے جب صوبے میں سماج وادی پارٹی کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے قد آور لیڈر اعظم خان کا طوطی بول رہا تھا، تو اعظم خان نے آپ کو پیشکش کی کہ مدرسے پر کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے اگر میری ضرورت ہو تو بتائیں، آپ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اس کے لیے آپ مدرسے میں پولیس وفورس تعینات کریں گے اور مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ مدرسے میں پولیس اور فورس آئے۔ اس کے بعد آپ مدرسے سے علیحدہ ہوگئے۔

رب کریم نے مالی خوشحالی اور فارغ البالی کے ساتھ کشادہ دستی اور فیاضی کی صفت سے بھی متصف فرمایا تھا، مہمان نوازی کے ساتھ اعزاء واقرباء کے ساتھ حسن سلوک ورواداری اور ضرورتمند و پریشان حال لوگوں کے کام آنا، پوری زندگی آپ کا معمول تھا۔ جس ضرورت مند نے بھی اپنی کسی ضرورت کا اظہار کر دیا، وہ متعلق ہو یا غیر متعلق، مسلمان ہو یا غیر مسلم، بس اس کی ضرورت کی تکمیل کے لیے پریشان ہو جاتے اور مال کے ساتھ اپنا پورا وقت بھی صرف کر دیتے۔ یہ کام خواہ کسی ہاسپٹل میں مریض کو داخل کرانے کا ہو، عدالت کچہرے اور تھانے کا ہو یا کوئی سیاسی مسئلہ ہو، مقدور بھر سب کی مدد کے لیے کوشاں رہتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہر میدان کے لوگوں سے آپ کے گہرے مراسم تھے، سب لوگ آپ کا ادب واحترام کرتے تھے۔ اس طرح آپ کی سفارش سے بہت سے لوگوں کے کام بن جاتے تھے اور یہ سب امور للہ فی اللہ انجام دیتے، کسی سے کسی صلہ وانعام کے طالب نہ ہوتے۔

الحاصل آپ انتہائی متحرک وفعال اور سرگرم انسان تھے، دینی واصلاحی اور ملی کاموں کے ساتھ، سیاسی، سماجی اور معاشرتی کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، تھکنا، بیٹھنا اور آرام کرنا، گویا آپ جانتے ہی نہ تھے۔ صبح گھر سے نکلتے تو عموماً رات ہی میں واپس آتے اور اس دوران مدرسہ، مسجد اور دیگر دینی واصلاحی کاموں میں مصروف رہتے، یا لوگوں سے ملنے جلنے اور ضرورت مندوں کی ضرورت

کی تکمیل میں مشغول رہتے۔ گویا وہ تھوڑی عمر میں بہت سے کاموں کو نپٹالینا چاہتے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند سے وابستگی

آپ کی انھیں خدمات جلیلہ کو دیکھ کر جمعیۃ علمائے ہند کی پرتاپ گڑھ یونٹ نے ۲۰۰۸ء میں آپ کو جنرل سکریٹری کی ذمہ داری سونپی، جس پر تاحیات آپ فائز رہے۔ جمعیۃ کے ملی واصلاحی کاموں سے آپ کا رابطہ پہلے سے تھا، ذمہ داری ملنے کے بعد یہی نہیں کہ یہ رابطہ مستحکم ہوا؛ بلکہ ابھی تک ذاتی طور پر تعلیمی، ملی اور اصلاحی جو خدمات آپ انجام دیتے تھے اور جس کا دائرہ محدود تھا، ایک بڑے پلیٹ فارم کے ملنے کی وجہ سے پورے ضلع تک پھیل گیا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر جمعیۃ علماء کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے اور ملک میں منعقد ہونے والی اس کی کانفرسوں اور میٹنگوں میں باضابطہ شریک ہونے لگے۔

پرتاپ گڑھ کی تحصیل کنڈہ کے گاؤں ''استھان'' میں آج سے کئی ایک سال پہلے ایک بڑا فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، جس میں مقامی مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا تھا، ان کو مارا پیٹا گیا تھا، ان کے مال واسباب کو لوٹ کر گھروں کو آگ لگادی گئی، یہاں تک کہ مسجدوں اور قبرستانوں کو بھی آگ کے حوالے کردیا گیا تھا اور بے پناہ مظالم ڈھائے گئے۔

فساد کی اطلاع ملتے ہی آپ وہاں پہنچے۔ حالات سخت تھے اور لوگ سڑکوں کے کنارے پڑے ہوئے تھے، نہ ان کے پاس کھانے کا انتظام تھا اور نہ سر چھپانے کی جگہ؛ آپ نے فوری طور پر جو کچھ ممکن ہوسکا کھانے پینے کا انتظام کیا اور سر چھپانیکا بندوبست کیا، اس کے بعد مستقل طور پر ان کی بازآبادکاری کے لیے جمعیۃ علماء وغیرہ کے تعاون سے ایک بڑی رقم فراہم کی۔

اسی طرح ''چاندپور کھروئیں'' میں جب آگ زنی کی گئی تو بھی اس موقع پر آپ مظلوموں کی مدد وفریادرسی کے لیے آگے آگے رہے اور قانونی، سیاسی ومالی جو کچھ تعاون آپ سے ہوسکتا تھا آپ نے کیا۔

مدرسہ تعلیم الدین سون پور

آپ ابھی دارالعلوم دیوبند ہی میں جماعت عربی پنجم کے طالب علم تھے، اسی زمانے میں آپ کو فکر ہوئی، گاؤں کے اس مکتب کو آگے بڑھانے کی، جسے آپ کے والد محترم خان محمد یونس صاحبؒ، عبدالغنی صاحب اور منشی عبدالمحیط وغیرہم، مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار پرتاپ گڑھی نوراللہ مرقدہ کے مشورے اور مبارک ہاتھوں سے قائم کرچکے تھے؛ چنانچہ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں حاضر ہوکر اس ارادے کا اظہار فرمایا اور مدرسے کا نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے پوچھا: ''مدرسے میں کس چیز کی تعلیم دوگے؟ کہا دین کی''۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: تو پھر ''تعلیم الدین'' رکھ دو! یہ سن ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔

چنانچہ چھٹیوں میں جب گھر آئے تو گاؤں میں ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں اپنے رفیق خاص اور تعلیمی سرگرمیوں کے سرپرست حضرت مولانا قاضی محمد امین مہتمم جامعہ رشیدیہ اوگئی پور کو خصوصی طور پر مدعو کیا، جو ابھی نئے نئے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر آئے تھے۔ اسی جلسے میں ان دونوں حضرات نے باقاعدہ مدرسہ ''تعلیم الدین'' کے قیام کا اعلان کیا اور اس طرح گاؤں سون پور کا مکتب مدرسہ ''تعلیم الدین'' کی شکل اختیار کرگیا۔

پھر مدرسے کی دیکھ بھال اور تعلیمی نظام کو سنبھالنے کے لیے پڑوس ہی کے گاؤں ''جٹھوارا'' کے رہنے والے حضرت مولانا عبدالرؤف زید مجدہ کا، جو اس وقت تجارت وغیرہ میں مصروف تھے، بحیثیت مہتمم وصدر مدرس تقرر کیا اور تنخواہ وغیرہ کی ادائیگی کی ذمہ داری اپنے ذمہ رکھی۔ ایک مرتبہ تنخواہ کی رقم کا انتظام نہ ہوسکا، تو حضرت مفتی محمود صاحبؒ سے جاکر عرض کیا، حضرت نے بخوشی اپنی جیب خاص سے پوری رقم ادا کردی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اس مدرسے کی ترقی کے لیے انتھک کوشش میں مصروف ہوگئے، پھر کیا رہا؟ چند ہی سالوں میں ''تعلیم الدین'' نے علاقے میں دینی تعلیم وتربیت کے حوالے سے اپنا ایک مقام بنالیا، پرائمری سے لے کر عربی دوم تک کی تعلیم ہونے لگی اور سیکڑوں طلبہ دارالاقامہ میں مقیم رہنے لگے۔ ایک بڑی زمین حاصل کرکے دارالاقامہ اور درسگاہوں کی تعمیر کرائی، ایک بڑی مسجد کی تعمیر ہوئی اور عالی شان گیٹ بنوایا۔

ادارہ ابھی ترقی کے منازل طے کررہا تھا کہ بعض بدخواہوں کی نظر لگ گئی اور مہتمم حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب اور آپ میں جو بحیثیت ناظم اعلی مدرسے کے امور انجام دے رہے تھے، شدید اختلاف ہوگیا۔ دراصل گاؤں ہی کے کچھ لوگ مدرسے میں زبردستی دخیل بننا چاہ رہے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے ایک نوعمر فاضل کو آلۂ کار بنایا تھا، دوسری جانب بعض مدرسے والوں کو بھی ''تعلیم الدین'' کی دن بدن بڑھتی مقبولیت برداشت نہیں ہورہی تھی اور انھیں ایک طرح سے حسد ہوگیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس کی رفتار مدھم پڑ جائے۔ اور یہ بات سب جانتے تھے کہ جب تک

مدرسے کا نظام حضرت مولانا محمد فاروق کے کنٹرول میں ہے، نہ تو مدرسے کی ترقی کو روکا جاسکتا ہے اور نہ اس میں منمانی چلائی جاسکتی ہے؛ اس لیے یہ مہم چلائی گئی کہ مولانا محمد فاروق صاحبؒ مدرسے سے علیحدہ ہوجائیں، اصلاً مدرسہ گاؤں کا ہے، گاؤں والے ہی چلائیں گے۔ (جب کہ آپ بھی اسی گاؤں کے تھے)۔

ڈاکٹر محمد الیاس راوی ہیں کہ اسی موقع پر میرے گھر مولانا عبدالرؤف اور مولانا محمد فاروقؒ کی بیٹھک ہوئی۔ مولانا عبدالرؤف کہہ رہے تھے کہ اگر مولانا محمد فاروق مدرسے میں رہیں گے تو میں نہیں رہ سکتا، دوسری جانب مولانا محمد فاروقؒ کہہ رہے تھے کہ اگر مولانا عبدالرؤف مدرسے سے مستعفی ہوتے ہیں تو میں بھی علیحدہ ہوجاؤں گا۔ مولانا کے بغیر مدرسے میں، میں نہیں رہوں گا۔ اس واقعے سے اختلاف کی نوعیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

جب اختلاف شدید ہوا اور گاؤں کے چند لوگوں کی بدتمیزیاں بڑھ گئیں، تو ۲۰۰۵ء میں، تقریباً ۲۵ رسال تک، قائم کرنے سے ہرا بھرا درخت بنانے تک، خدمت انجام دینے کے بعد، آپ علاحدہ ہوگئے۔ افسوس کہ آپ کی علاحدگی کے بعد مدرسہ اپنا وجود قائم نہ رکھ سکا، چند سالوں کے بعد حضرت مولانا عبدالرؤف بھی علاحدہ ہوگئے۔ اور پھر مدرسہ کی تعلیمی سرگرمیاں پرائمری درجات تک سمٹ گئیں اور آج مدرسے کی طویل وعریض مسجد وعمارت طالب علموں ونمازیوں کے لیے نوحہ خواں نظر آتی ہے۔

جامعہ عبداللہ ابن مسعود پرتاپ گڑھ

یہاں سے علاحدگی کے بعد آپ نہ تو ہمت ہارے اور نہ بیٹھے؛ حالاں کہ اتنے بڑے حادثے کے بعد اچھے اچھے دل گردے کے لوگ ٹوٹ جاتے ہیں اور اگلی منزل طے کرنا ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے؛ چنانچہ ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ سن ۲۰۰۸ء میں، آپ نے ایک بڑے منصوبے اور نئے عزم وحوصلے کے ساتھ شہر پرتاپ گڑھ میں ''جامعہ عبداللہ ابن مسعودؓ'' کی بنیاد رکھ دی اور پھر چند ہی سالوں میں ایک بڑی زمین خرید کر عمارت بھی کھڑی کردی اور ایک عالی شان جامع مسجد بھی بنادی۔ الحمدللہ! جامعہ عبداللہ ابن مسعود اپنی تعلیم وتربیت کے حوالے سے اس وقت پرتاپ گڑھ کے مرکزی اداروں میں سے ایک ہے، جہاں ابتدائی پرائمری سے لے کر عربی سوم تک کی تعلیم جاری ہے۔ اساتذہ وملازمین کے ایک بڑے اسٹاف کے ساتھ طلبہ کی ایک بڑی تعداد بھی دارالاقامہ میں مقیم ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علاقوں میں کئی ایک مکاتب دینیہ بھی آپ نے قائم کیے، جو ماشاء اللہ خدمت

دین میں مصروف ہیں۔

ایک اہم واقعہ

آپ نے کس خلوص وللّٰہیت کے ساتھ دین کی خدمت انجام دی اور مدارس ومکاتب قائم کیے،اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے،جس کے راوی عزیزم مولوی مامون الرشید ہیں۔عزیزم نے بتایا کہ۲۰۱۳ء میں ممبئی سے مدرسے کی ایک بڑی رقم لے کر والد صاحب واپس آرہے تھے،ساتھ میں، میں اور حافظ ہدایت علی استاذ جامعہ عبداللہ ابن مسعود تھے۔رقم ایک کارٹون میں رکھی ہوئی تھی۔ الہ آباد اسٹیشن پر اتر کر جب باہر آئے تو اپنی گاڑی پر کارٹون رکھنا بھول گئے۔اور کارٹون چھوڑ کر وہاں سے تقریبا ۸۰ رکلومیٹر دور جب اپنے گھر آ گئے، اور سامان دیکھا تو کارٹون غائب تھا۔آپ نے کہا کہ اس میں مدرسے کی رقم تھی اور آج تک میں نے کبھی بھی مدرسے کی رقم میں خرد برد نہیں کیا؛اس لیے مجھے یقین ہے کہ رقم ضائع نہیں ہوسکتی؛اس لیے تم لوگ واپس جاؤ اور تلاش کرو، کارٹون مل جائے گا۔ہم لوگوں نے کہا کہ ممکن ہی نہیں،اتنی تاخیر ہوگئی ہے اور واپس جانے میں بھی ڈھائی تین گھنٹے لگیں گے۔کون چھوڑ دے گا؟ اس لیے جانے میں کوئی فائدہ نہیں، جو ہونا تھا ہوگیا؛لیکن آپ نے اصرار کیا تو ہم دونوں واپس گئے۔عزیزم کا بیان ہے کہ کارٹون اسی جگہ جوں کا توں رکھا ہوا ملا، جہاں چھوٹا تھا اور رقم بھی مکمل محفوظ تھی۔اسے آپ کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔

مساجد کی تعمیر

''مساجد کی تعمیر'' آپ کی خدمات کا ایک جلی عنوان ہے۔ضلع پرتاب گڑھ میں آپ کی محنت و کوشش اور بعض ملی تنظیموں کے تعاون سے تقریبا ڈھائی تین سوئی یا پرانی مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں۔ایسے علاقوں میں مسجدوں کی تعمیر جہاں کے مسلمانوں کی مالی حالت ایسی نہ ہو کہ وہ مسجد تعمیر کرا سکیں،اس کے لیے جدوجہد کرنا اور دوڑ دھوپ کر تعمیر کرا دینا، یقیناً آپ کے حسنات میں اضافہ اور رب کریم کے یہاں ترقی درجات کا بہترین ذریعہ بنے گا اور یہ مسجدیں و مدرسے جب تک قائم رہیں گے آپ کے اعمالِ حسنہ میں ان کا ثواب لکھا جاتا رہے گا۔

خاکہ حیات

آپ کی ولادت باسعادت ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔آپ کے والد خان محمد یونس رحمۃ اللہ علیہ انتہائی غیور وخوددار، باخلاق و باکردار، نیک وصالح انسان تھے۔خان صاحب عالم و فاضل تو نہ تھے؛لیکن مطالعہ کا اچھا شوق تھا،اردو زبان وادب کا بھی ذوق تھا۔شاعرِ مشرق اکبر الہ آبادی مرحوم کے اشعار

نوک برزبان رہتے تھے۔محسوس ہوتا تھا پورا دیوان یاد کر رکھا ہے۔

ملک کی تقسیم کے وقت خان صاحب فوج میں تھے اور اس وقت موجودہ پاکستان کے کسی علاقے میں تعینات تھے۔آپ کو موقع تھا کہ پاکستان کی شہریت اختیار کر لیں؛ لیکن ہندوستان میں اپنے اعزاء واقرباء کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور ملازمت ترک کر کے وطن سون پور میں آ کر مقیم ہو گئے۔ گاؤں سون پور، تھانہ جٹھوارہ کے تحت آتا ہے اور شہر پرتاپ گڑھ سے تقریباً ۲۵ رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔سون پور ایک بڑا مسلم گاؤں ہے، جہاں سو ڈیڑھ سو مسلمانوں کے مکانات ہوں گے۔

خان صاحب علم دوست تھے اور علماء وصلحاء سے بڑا تعلق تھا خصوصاً مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار نوراللہ مرقدہ سے بے پناہ محبت وعقیدت تھی اور بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے۔خاں صاحب کے تین صاحب زادوں میں مولانا محمد فاروق سب سے چھوٹے تھے۔بڑے صاحب زادے جناب محمد عاشق مرحوم تھے اور منجھلے صاحب زادے حاجی محمد معشوق ہیں، جوالحمدللہ بقید حیات ہیں۔

ابتدائی تعلیم

تعلیم کا آغاز گاؤں ''کٹلیا'' کے مکتب سے ہوا۔مزید تعلیم کے لیے قصبہ ڈروا کے ''مدرسہ حفظ العلوم'' میں داخل ہوئے۔جو آپ کے گاؤں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔وہاں حضرت مولانا عبدالقدوس اعظمی ثم پرتاپ گڑھی نوراللہ مرقدہ سے حفظ قران کریم کیا اور اردو وفارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔

اس کے بعد مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار نوراللہ مرقدہ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا قاضی محمد امین مہتمم جامعہ رشیدیہ اوگئی پور پرتاپ گڑھ کے ساتھ، جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے، سہارن پور چلے گئے اور مدرسہ قاسم العلوم گاگلہیڑی میں فارسی جماعت اول میں داخلہ لیا۔ یہاں پر آپ کے خصوصی استاذ حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈوی سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند تھے اور ساتھ میں مصلح ملت کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا محمد نسیم قاسمی نوراللہ مرقدہ تھے۔ یہاں ایک سال ہی رہنا ہوا، اگلے سال یہ دونوں حضرات مدرسہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ چلے گئے اور جماعت فارسی دوم اور عربی اول کی تعلیم مکمل کی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

جماعت عربی دوم کی تعلیم کے لیے یہ دونوں حضرات دارالعلوم دیوبند آ گئے اور پھر یہیں سے ۱۹۸۳ء میں دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی۔بزمانۂ قیام دارالعلوم دیوبند آپ نے خصوصی طور پر

جن اساتذۂ عظام سے پڑھا یا استفادہ کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خان سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا شیخ عبدالحق اعظمی نائب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا معراج الحق دیوبندی سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حسین احمد بہاری، شیخ الادب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی، حضرت مولانا ریاست علی بجنوری، حضرت مولانا حامد میاں رحمہم اللہ تعالی اور حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی دامت برکاتہم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

بزرگوں سے محبت وعقیدت اور اصلاحی تعلق

طالب علمی کے دور ہی سے درسگاہ کی پابندی کے ساتھ نمازوں کا اہتمام اور بزرگوں کی مجلسوں میں حاضری کا بھی معمول رہا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مجلس میں شرکت کے ساتھ ان کے درس ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں بھی حاضری رہتی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی سے تو انتہائی گہرا تعلق تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے دیگر مشائخ و بزرگوں سے بھی بے پناہ محبت وعقیدت رکھتے تھے اور ان کی ملاقات کے لیے مستقل سفر کرتے رہتے تھے۔

مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار نور اللہ مرقدہ سے تو دامادی ہی کا رشتہ تھا، اس طرح گویا حضرت کے گھر کے ایک فرد ہی تھے۔ نیز حضرت کے اصلاحی وعلمی کاموں سے بہت متاثر بھی تھے اور انھیں کے نقش قدم پر رہ کر پوری زندگی اصلاح معاشرہ، مکاتب ومدارس کے قیام اور علاقے کے مسلمانوں کے آپسی تنازعات کو صلح صفائی سے حل کرانے کے لیے کوشاں رہے۔

شیخ المشائخ عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی نور اللہ مرقدہ سے بڑا تعلق تھا، حضرت کا گاؤں آپ کے گاؤں سے قریب ہے؛ اس لیے حضرت کے یہاں باقاعدہ حاضری رہتی تھی۔ حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی قدس سرہ، حضرت مولانا قاری محمد صدیق باندوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یونس سابق شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارن پور نور اللہ مرقدہ جیسے مشائخ کے یہاں بھی حاضری کا معمول رہا اور سب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ حضرت مولانا قاری محمد صدیق باندویؒ کے ساتھ بنگال گئے تھے، پروگرام میں حضرت مولانا محمد یونسؒ بھی مدعو تھے۔ حضرت شیخ یونسؒ کو چار جگہ بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دینا تھا، دو جگہ درس دینے کے بعد حضرت تھک گئے اور منتظمین سے بقیہ پروگراموں میں شرکت سے

معذرت کرلی۔اب لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ مولانا محمد فاروق کو لے جاؤ اور آخری سبق انھیں سے پڑھوا لو! پھر حضرت شیخ نے مولانا سے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں اہم باتیں بتا دیتا ہوں یہی بیان کر دینا؛ چنانچہ آپ گئے اور حضرت شیخ کی نیابت کرتے ہوئے بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا۔حضرت شیخ کے مزاج سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ حضرت شیخ کی نیابت کرنا یا حضرت کا کسی کے علم پر اعتماد کر لینا کس قدر اہمیت کی بات ہے۔

بعدہ شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی دامت برکاتہم سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم کیا اور اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے۔

طالبان علوم نبوت سے بھی بڑی محبت فرماتے تھے،خصوصاً جن طلباء نے آپ سے کچھ پڑھا تھا یا آپ کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی،سب سے رابطے میں رہتے اور ان کی خبر گیری فرماتے تھے۔

خانقاہ تلوجہ ممبئی

چند سالوں سے تلوجہ ممبئی میں مجلس ذکر وارشاد اور خانقاہ کا سلسلہ شروع فرمایا تھا، جہاں سال میں ایک دو مرتبہ تشریف لے جاتے اور مریدین ومتوسلین کو اپنے فیوض وبرکات سے مستفیذ فرماتے۔

درس قرآن

تمام تر مصروفیات کے باوجود تفاسیرِ قرآن کریم ودیگر دینی کتابوں کے مطالعے کا معمول تھا اور اپنے بچوں کو بھی تفاسیر قرآن کریم کے مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے۔مدرسے میں درس وتدریس کا بھی سلسلہ تھا؛لیکن دیگر مصروفیات کی وجہ سے باقاعدہ درسی مصروفیت جاری رکھنا مشکل ہوتا تھا؛اس لیے اپنے علمی ذوق کو باقی رکھنے کے لیے اور قرآن کریم کی تعلیمات سے امت کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے گھر سے قریب کی مسجد میں بعد نماز فجر روزآنہ درسِ قرآن کریم کا سلسلہ تقریباً بیس پچیس سال سے جاری کر رکھا تھا،نمازِ فجر خود ہی پڑھاتے اس کے بعد نماز اشراق تک درس دیتے۔شہادت کے دن بھی درس دیا تھا۔

اولاد واحفاد اور ان کی دینی تعلیم وتربیت

اپنے خسر مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرح آپ نے بھی اپنے تمام بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ فرمایا؛ بلکہ تمام بچوں کو حضرت ہی کے سپرد بھی کر رکھا تھا؛ تاکہ حضرت ہی کی نگرانی اور پرورش میں بچوں کی تعلیم وتربیت ہو۔ماشاء اللہ رب کریم نے اس مقصد میں بھی کامیابی عطا فرمائی اور آج تمام بچے علم دین سے آراستہ ہوکر نمایاں طور پر خدمت دین کا فریضہ انجام دے

رہے ہیں۔

بڑے صاحبزادے عزیزم حافظ مولوی مفتی مامون رشید قاسمی سلّمہٗ ہیں۔ جو دارالعلوم اسلامیہ عربیہ تلوجہ نوی ممبئی میں استاذ حدیث ہیں اور شمس مسجد کھارگھر ممبئی میں امام وخطیب ہیں۔ دوسرے صاحبزادے عزیزم حافظ مولوی محمد ارشد قاسمی سلمہ اللہ تعالی ہیں جو جامعہ عبداللہ ابن مسعود میں استاد عربی ہیں اور آپ کی شہادت کے بعد جامعہ کے ناظم اعلی مقرر ہوئے۔ تیسرے صاحبزادے عزیزم حافظ مولوی محمد اسعد قاسمی سلمہ ہیں، جو جامعہ عبداللہ ابن مسعود کے نائب ناظم ہیں اور اپنے والد کی جگہ جمعیۃ علماء پرتاپ گڑھ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے ہیں۔

چار صاحبزادیاں ہیں، جن میں بڑی صاحب زادی حافظ قران ہیں۔ دوسری اور تیسری حافظ قرآن کے ساتھ باقاعدہ عالمہ بھی ہیں اور تیسری صرف عالمہ ہیں۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی عابدہ زاہدہ صالحہ ہونے کے ساتھ حافظ قرآن ہیں اور ابتدائی عربی وفارسی کی اچھی واقفیت رکھتی ہیں۔ ایک پوتا اور نواسہ بھی حفظ قران کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، بقیہ زیر تعلیم ہیں، اس طرح پورا گھر گہوارہ علم و فن بنا ہوا ہے۔ فالحمدللہ علی ذلک

تدفین

اس مرد مجاہد کی شہادت کا واقعہ یکم ذی الحجہ ۱۴۴۵ھ مطابق ۸/جون ۲۰۲۴ء بروز ہفتہ پیش آیا اور نماز جنازہ دوسرے دن صبح دس بجے دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث ونائب مہتمم حضرت مولانا مفتی راشد اعظمی مدظلہ کی اقتداء میں ادا کی گئی۔ بعدہٗ گاؤں ہی کے آبائی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

❊ ❊ ❊

مسائل وفتاویٰ

سوال: احقر کوسسرال کی جانب سے تھوڑی سی زمین ملی ہے، احقر نے پردھان منتری وکاس یوجنا والا فارم بھر دیا ہے اور وہ منظور بھی ہوگئی ہے؛ جب کہ احقر کے پاس ایک کمرہ رہائش کے لیے بنا ہوا موجود ہے، احقر کے پاس نہ ہی اس کے علاوہ کوئی بھی پروپرٹی ہے اور نہ ہی بینک بیلنس ہے تو کیا ایسی صورت میں حکومت ہند سے مکان بنوانے کے لیے پیسے لینا جائز ہے؟

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: مذکورہ یوجنا (پردھان منتری وکاس یوجنا) کے بارے میں شرائط وتفصیلات اہلِ حکومت سے معلوم کرلیں کہ یہ یوجنا کن لوگوں کے لیے ہے اور اس کو لینے کے کیا شرائط ہیں؟ پھر اس کی روشنی میں اپنے احوال کا جائزہ لیں، اگر حکومت کی طے کردہ شرطوں پر آپ اترتے ہیں تو آپ کے لیے مذکورہ یوجنا کے تحت پیسے لینا جائز ہوگا، ورنہ احتراز کریں!

فقط واللّٰہ اعلم

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی، محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

وقار علی غفرلہ
دارالافتاء دارالعلوم دیوبند
۲۵ر شوال ۱۴۴۵ھ

==========

سوال: عرض یہ کرنا تھا کہ بہت سارے طلباء آپ کے یہاں کے (دارالعلوم دیوبند) کے اور بھی دیگر مفتیان اگر کہیں جاتے ہیں، کسی مقام یا جگہ پر وہاں پر ویڈیو بناتے ہیں، اس میں تقریر، نعت یا کوئی دیگر اسلامی باتیں چلا کر بناتے ہیں اور یہ آج کل بہت بڑا رواج بن چکا ہے، کیا ایسے ویڈیوز بنانا صحیح ہے؟ اور ان ویڈیو سے کمپنی یا انسٹاگرام یا یوٹیوب جو پیسہ دیتا ہے، کیا وہ جائز ہے؟ ان ویڈیو میں کرتے کچھ نہیں؛ بس راستے میں چل رہے تو بنالی، مسجد رشید میں ہیں تو ویڈیو بنالی بائیک چلا رہے ہیں، کار چلا رہے ہیں تو ویڈیو بنالی، کچھ کھا رہے ہیں تو ویڈیو بنالی، قرآن وحدیث کی روشنی

میں جواب دیں کہ کیا وہ پیسہ جائز ہے یا نہیں؟ جزاک اللہ خیراً۔
فضیل احمد ابن حافظ محمد کفیل، امام وخطیب جامع مسجد وعیدگاہ موضع بھاگووالا، ضلع بجنور۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: جاندار کی تصویر کشی بلاضرورت شدیدہ چاہے ڈیجیٹل کیمرے کے ذریعہ ہو، ناجائز ہے، اکابر علماء دیوبند اور علماء محققین کی ایک بڑی جماعت کا یہی موقف ہے، آج کل موبائل کے ذریعہ ناجائز وممنوع تصاویر پر مشتمل ویڈیوز بنانے اور اسے یوٹیوب وغیرہ پر اپلوڈ کرنے اور پھر اس سے کمائی کرنے کا جو رواج عام ہوتا جارہا ہے، یہ بہت افسوسناک ہے، مسلمانوں کو اس فعل سے اور اس طرح کمائی کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ **فقط واللّٰہ اعلم**

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ

محمود حسن بلند شہری غفرلہ، محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ — دارالافتاء دارالعلوم دیوبند
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند — ۲۰ر شوال ۱۴۴۵ھ

==========

سوال: ہمارے والدین بوڑھے ہوچکے ہیں، والد صاحب معذور، صاحب فراش ہوچکے ہیں، بیماری کی حالت میں چل رہے ہیں، اٹھنے بیٹھنے پیشاب پاخانے میں سہارے اور خدمت کے محتاج ہوگئے ہیں، والدین کی کفالت، خرچے، علاج کی ذمہ داری کس پر ہے؟ والد صاحب کے تین بیٹے زندہ ہیں، تینوں برسرروزگار ہیں، ایک پوتا بھی برسرروزگار ہے۔ تین بیٹیاں اور تین داماد زندہ ہیں تینوں داماد برسرروزگار ہیں والدین کے علاج، خرچے، کفالت اور خدمت کی ذمہ داری کن پر ہے؟
محمد احمد، امبیڈکر نگر

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. الجواب بعون هلم الصواب: صورت مسئولہ میں اگر آپ کے بوڑھے، معذور، بیمار اور محتاج والدین غنی ہیں یعنی اُن کے پاس خرچ وعلاج کے پیسے وغیرہ موجود ہیں تو ان ہی کے مال سے خرچ کیا جائے گا اور اگر ان کے پاس مال نہیں ہے تو ان کی کفالت (نفقہ وخدمت) کی ذمہ داری برسرروزگار تینوں بیٹوں پر ہے۔ **فقط واللّٰہ اعلم**

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ

زین الاسلام قاسمی، محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ — دارالافتاء دارالعلوم دیوبند
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند — ۲۹ر شوال ۱۴۴۵ھ

نئی کتاب

نام : دفاعِ سیرت طیبہ
مصنف : جناب مفتی محمد اشرف عباس قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند
ضخامت : ۱۵۰ قیمت: (درج نہیں)
ناشر : مکتبہ ابن عباس دیوبند
تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

==========

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے اونچا مقام حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہر عیب سے پاک پیدا فرمایا تھا، آپ کی شانِ اقدس میں شاعرِ دربار نبوی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أحْسنَ منك لم ترَ قَطُّ عَيْني وَأجْمَلَ منكَ لَمْ تَلِدِ النساءُ
خُلِقْتَ مُبَـرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ كَأنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تشاءُ

ترجمہ: آپؐ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت (بچہ) عورتوں نے جنا بھی نہیں، آپؐ ہر عیب سے پاک صاف پیدا ہوے؛ گویا آپؐ اُسی طرح (کی صورت وسیرت لے کر) پیدا ہوے جیسی آپؐ چاہتے تھے۔

یہی حقیقت ہے، اور ہر مسلمان کا عقیدہ بھی؛ مگر دشمنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو نشانہ بنایا، آپ کے نسب پر مختلف زاویوں سے اعتراض کیا، وحی کی کیفیات کو مرگی سے تعبیر کیا، قرآنِ مقدس کو تورات وانجیل سے ماخوذ کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کو افسانوی انداز میں بحیرہ راہب اور ورقہ بن نوفل کی شاگردی کا عطیہ قرار دیا، اسلام کی اشاعت کو تلوار کا کرشمہ بتایا، تعددِ ازدواج پر شبہ کیا، حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ کے نکاح پر اعتراضات کیے، یہی نہیں ان کے

علاوہ سیکڑوں اعتراضات کیے، جن سے ایک طرف اسلام کی شبیہ بدنما کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت کو تارتار کیا۔ باغیرت اہلِ قلم کی کمی نہیں؛ جنھوں نے دفاعِ اسلام میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، انھیں باغیرت اور باتوفیق نوخیز ونوجوان اہلِ قلم میں جناب مولانا محمد اشرف عباس قاسمی مدرس دارالعلوم دیوبند ہیں جنھوں نے اپنے اشہبِ قلم کی جولانی کا رخ دفاعِ سیرت کی طرف کیا اور خرمن باطل کو تاخت وتاراج کرکے رکھ دیا، دفاعی مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور وہ ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند کی زینت بنتے رہے، پھر ان سب کو یکجا کرکے کتابی شکل دے دی، ''دفاعِ سیرت طیبہ'' میں تقریباً دس اعتراضات کے جواب دیے گئے ہیں، ہر سوال کا پہلے تفصیلی اور تحقیقی جائزہ لیا ہے، پھر ان کا جواب بھی قابلِ اعتماد مراجع سے بڑی تفصیل سے تیار کیا ہے، جہاں کسی بات کے سمجھانے کے لیے تمہید کی ضرورت تھی تمہید بھی لکھی ہے، سارے جواب تشفی بخش ہیں، قاری ہر جگہ اطمینان کی کیفیت محسوس کرتا ہے، مراجع میں کتب تفسیر، حدیث، تاریخ، سیرت اور دفاع اسلام میں لکھی گئی بہت سی کتابیں ہیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، بیہقی، مرقات، عمدۃ القاری، فتح الباری، ابن کثیر، احکام القرآن، معالم التنزیل، مناہل العرفان، معارف القرآن، بیان القرآن، سیرت عائشہ، رحمۃ للعالمین، تاریخ الرسول، محمد في المدینۃ، حیاۃ محمد، محمد المثل الاعلیٰ، حضارۃ العرب، اسد الغابہ، سیر اعلام النبلاء اور دیگر کتابوں کے حوالوں کو دیکھ کر قاری مرعوب ہوجاتا ہے، ان سب کے علاوہ موصوف کے معقولی استدلالات سے قاری متاثر ہوے بغیر نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ کہ ''دفاعِ سیرت طیبہ'' ایک شاندار کارنامہ ہے، اس میں ایک طرف موصوف کی حمیتِ اسلامی کھل کر سامنے آئی ہے تو دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت حرف حرف میں جھلکتی ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کی خدمت کو قبول فرمائیں!

امید ہے کہ قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اہلِ نظر آنکھوں کا سرمہ؛ اہلِ دل تسلی کا سامان اور دینی ادارے اس کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیں گے۔ ضرورت ہے عالمی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو؛ تاکہ اس کا دائرۂ افادہ بڑھے اور اس کی افادیت عام ہو۔ وباللہ التوفیق!

❊ ❊ ❊